دو زبانیں، دو ادب

اردو اور ہندی کے تناظر میں

پروفیسر عبدالستار دلوی



دو زبانیں، دو ادب

پروفیسر عبدالستار دلوی

دو زبانیں، دو ادب

(اُردو اور ہندی کے تناظر میں)

پروفیسر عبدالستار دلوی

(سابق پروفیسر و صدر شعبہ اُردو، ممبئی یونیورسٹی)

بک ٹاک

میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ، لاہور

Ballyhough railway station has two clocks which disagree by some six minutes. When one helpful Englishman pointed the fact out to a porter, his reply was Faith, sir, if they was to tell the same time, why would we be having two of them?

From: *The Five Clocks*
by *Martin Joos*

دو زبانیں، دو ادب

پروفیسر عبدالستار دلوی

ناشر ——— بک ٹاک، لاہور
اشاعت ——— 2019ء
طابع ——— بھٹو پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت ——— -/695 روپے

بک ٹاک ——— میاں چیمبرز، 3- ٹمپل روڈ لاہور
فون ——— 042-36374044-36370656-36303321
Email:book_talk@hotmail.com
www.booktalk.pk
www.facebook.com/booktalk.pk

رہے نہ ایبک وغوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو
(اقبال)

سر تیج بہادر سپرو

اور

ان تمام اردو دوستوں کے نام

جو

اردو کو اپنا مشترکہ ناقابل تقسیم تہذیبی سرمایہ سمجھتے ہیں

"اردو زبان ہم ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباواجداد سے ایک اور مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے اور یہی وہ زبان ہے جو قریب قریب ہر صوبے میں کم و بیش بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر قلق ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس پچاس سال سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ عوام غیر فطری طور پر ایک بناوٹی زبان سیکھیں اور اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کریں جو فطری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور ان کی آپس کی رواداری اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔"

سر تیج بہادر سپرو

ہماری قومی زبان: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۱ء

فہرست

○ حرف آغاز 11

پہلا باب: تمہید 23

دوسرا باب: طریق تحقیق 92

تیسرا باب: اردو اور ہندی پر ایک نظر 101

چوتھا باب: زبان اور بولی کے رشتے اور مسائل 143

پانچواں باب: تاریخ، فرقہ واریت اور گیان چند 172

چھٹا باب: فرقہ وارانہ سیاست اور اردو ہندی کا مسئلہ 200

ساتواں باب: فارسی اور سنسکرت سے اردو کا لسانی اور ادبی رشتہ 208

آٹھواں باب: ایک زبان اور دو رسم الخط: اردو ہندی کے پس منظر میں 232

نواں باب: ختم کلام اور ضمیمہ 242

دسواں باب: اردو اور ہندی: تاریخی و لسانی تناظر میں 255

○ منتخب کتابیات 269

A linguist deaf to the poetic functions of language and a literary scholar indifferent to linguistic problems and unconversant with linguistic methods are equally flagrant anachronism.

Roman Jakobson

حرف آغاز

اردو اور ہندی ہندوستان کی دو اہم ترین زبانیں ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں اور اس لحاظ سے ان میں قواعدی اعتبار سے بھی اور لفظیات کے اعتبار سے بڑی مماثلت ہے تاہم یہ دونوں اپنی اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں اور ان دونوں کی تربیت الگ الگ ماحول میں ہوئی ہے۔ ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہونے کے باوجود دونوں کی عمروں میں تفاوت ہے۔ اردو اور ہندی میں عمروں کا جو فرق ہے وہ دو چار برس کا فرق نہیں بلکہ صدیوں کا فرق ہے، اس لحاظ سے اردو کی قدامت مسلم ہے۔ یہ صوفیا کی خانقاہوں میں پرورش پاتی رہی اور سلاطین کے درباروں سے بھی وابستہ رہی۔ امیر خسرو اور ان کے معاصر صوفیا اور سنتوں نے اس کی پرورش و پرداخت کی اور اسے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اپنے ارتقا کے طویل عرصہ میں یہ مختلف ناموں سے پہچانی جاتی رہی۔ ابتدا میں اسے ہندوی کے نام سے نوازا گیا، پھر ہندی، ریختہ، ہندوستانی اور اردو کہلائی۔ اس کے البیلے پن میں سنسکرت کے ساتھ جو اس کی ماں ہے، فارسی اور عربی نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور اس کے حسن کو سنوارا ہے اور جمالیات کو نکھارا ہے۔ یوں بھی فارسی اس کے لیے کوئی اجنبی زبان نہیں بلکہ اس سے قریب ترین رشتہ رکھتی ہے۔ عربی کا رشتہ ذرا دور کا رشتہ ہے، تاہم عربی نے بھی اس کی تربیت میں حصہ لیا اگرچہ فارسی کے مقابلہ میں کم ہے۔ تہذیبیں اور زبانیں خالص نہیں ہوتیں، یہ ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتی ہیں۔ لہٰذا اپنے تشکیلی دور میں اس نے کھڑی بولی کے پاس پڑوس کی زبانوں

کے بھی اثرات قبول کیے اور اس طرح لسانی دلکشی اور صحت و توانائی کا ایک بے مثال نمونہ بن گئی۔ یہ اپنے اندر اپنی تمام تر ہندوستانیت کے باوجود اسلامی رنگ بھی رکھتی ہے۔ یہ اسلامی رنگ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہے، جس کی وجہ سے اس میں "کفر و اسلام" دونوں سے نسبت پیدا ہوئی، اسی لیے اسے بعض اوقات اسلامی زبان کے نام سے بھی پہچانا گیا۔ اسے یا دنوں (مسلمانوں) کی زبان کہا گیا ہے۔ کبھی اسے "مسلمانی" کا نام دیا گیا تو کبھی بطور خاص جنوب میں ترکا ماتا (ترکوں کی زبان) کہا گیا۔ "اسلامی زبان" کا یہ رنگ دیگر علاقائی زبانوں کے حوالے سے ہے جو خالص تہذیبی اعتبار سے ہندو زبانیں ہیں اور جن کا دائرہ کار محدود ہے۔ دراصل اردو ہندوستانیت اور اسلامیت کا ملا جلا روپ ہے اور اس مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی علامت ہے جو زمانہ وسطی میں ترقی پاتی رہی۔ یہ تہذیب نہ ہندو تہذیب ہے نہ اسلامی تہذیب ہے، بلکہ صرف ہندوستانی تہذیب ہے۔ وحید الدین سلیم نے اسے ہندالسانی تہذیب کہا ہے۔ چند زائد الفاظ کے استعمال سے کوئی زبان ہندو یا مسلمان نہیں بنتی بلکہ اس کا مزاج، اس کی فکر، اور اس کا خمیر اسے مذہب اور ذاتوں سے وابستہ کرتا ہے۔ لیکن یہ رشتے کبھی کبھی کمزور بھی پڑ جاتے ہیں اور اس طرح زبانوں میں عالمگیریت (Globalisation) کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اردو ایک ملی جلی زبان کی حیثیت سے ارتقا پذیر ہوئی، تاریخ اور حالات کے تقاضوں کے تحت اس کی نشوونما فطری تھی۔ ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کے مورخین نے اردو کی اصل اور فطری ارتقا کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل سے لے کر بیسویں صدی کے تہذیبی، لسانی اور ادبی مورخین تک سب نے اس کے تعلق سے اپنی آرا پیش کی ہیں۔ انیسویں صدی کے انگریز مستشرقین جیسے گلکرسٹ، ڈنکن فوربس، فیلن، گریرسن، ڈاکٹر تاراچند، متعدد ہندی کے ودوانوں نے بھی اردو کی اصل اور قدامت کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی ۱۹۴۲ء کے بعد سے ۱۹۷۰ء تک مذکورہ علاوہ زبان سے متفق نہیں تھے اور

وہ اردو کو "مسلمانی ہندی" کہتے تھے۔ یہ ایک گمراہ کن نظریہ تھا، زیادہ صحیح بات تو یہ تھی کہ وہ ہندی کو، جو ۱۸۵۰ء کے بعد میں اردو کے نقش قدم پر مصنوعی طور پر پروان چڑھائی گئی تا کہ اس سے "ہندو" شناخت قائم رہے اسے "ہندوؤں کی اردو" کہتے۔ چٹرجی کو بعد میں اس کا شدید احساس پیدا ہو گیا تھا کہ ان کے ابتدائی نظریات غلط تھے اور حقیقتاً اردو ہی اصل زبان ہے جس سے ہندی نے جنم لیا ہے۔ انہوں نے تحریری طور پر ۱۹۷۳ء کے اپنے خطبات میں جو انہوں نے بمبئی میں دیئے تھے، اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا اور اردو کو اصل زبان قرار دے کر اس کی قدامت کا اعتراف کیا تھا۔

ہندی کا ارتقا اردو کے برخلاف انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوا۔ اس کے پس پشت اس عہد کی فرقہ وارانہ ذہنیت اور انگریز اور ہندو سیاست تھی۔ اردو کے خلاف ہندی کی سیاست کو انگریزوں نے سہارا دیا اور ہندوستان کی واحد مشترکہ لسانی میراث کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس لسانی تقسیم کا اثر ہندوستان کی سیاست پر بھی پڑا اور یہ لسانی نزاع، سیاسی نزاع اور بعد میں فرقہ وارانہ نزاع میں تبدیل ہوئی، لہٰذا ملک کی سلامتی اور یکجہتی کے لیے اردو اور ہندی دونوں کی اپنی اہمیت کے پیش نظر مہاتما گاندھی نے ہندوستانی بمعنی اردو کے برخلاف اپنا مخصوص قومی زبان "ہندوستانی" کا نظریہ پیش کیا۔ ہندوستانی کا یہ گاندھیائی نظریہ اردو اور ہندی کے لیے ایک طرح کا محافظانہ نظریہ تھا اور ہندوستانی اردو اور ہندی پر محیط ایک مشترکہ نام بن گیا جس کے تحت یہ دونوں زبانیں زندہ رہ سکتی تھیں اور جس کی ہندوستانی متحدہ قومیت کے لیے ضرورت تھی، مگر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندی، سیاست پر غالب آ گئی اور گاندھیائی ہندوستانی کے نظریہ کو سیاسی شکست دیکھنی پڑی۔ اس مسئلہ پر کئی دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بعد میں اردو اور ہندی متوازی خطوط پر ترقی کرتی رہیں اور ان دونوں کو لسانی، تہذیبی، سماجی، لسانی اور اسلوبیاتی نیز ادبی نقطہ نظر سے جداگانہ زبانیں تسلیم کیا گیا۔ اردو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دی گئی اور ہندی کو

ہندوستان کی سرکاری زبان قرار دیا گیا، تاہم ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں میں اردو کو بھی ایک قومی زبان کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ اس مسئلہ کو یہیں دفن ہو جانا چاہیے تھا کہ اردو اور ہندی اب دو آزاد زبانیں ہیں۔ دونوں کی اپنی صوتی، صرفی اور سماجی لسانی خصوصیات اور آزادانہ اسالیب ہیں۔ ان کی لفظیات میں مماثلت کے باوجود بڑے اختلافات ہیں۔ ان کی علمی اصطلاحات ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں، دونوں کے مزاج میں صبح و شام (Chalk & Cheese) کا فرق ہے اور آزادانہ ترقی کر رہی ہیں۔ ایک نے اپنے آپ کو متحدہ ہندوستانی قومیت اور ہندوستان کے سیکولر ازم سے جوڑے رکھا ہے تو دوسری، یعنی ہندی کا غالب رجحان ہندو ہندی قومیت سے ہے اور یہی اس کی علامت ہے۔ اردو اور ہندی میں یہ نمایاں فرق تیزی سے روبہ ترقی رہا۔ اردو کی اپنی آزادانہ شناخت ہے تاہم ہندی کو اپنی شناخت کی تلاش ہے۔ اس مسئلہ پر ہندی اور اردو کے ماہرین نے کافی لکھا ہے۔ تاہم اکثر یہ بھی دیکھا گیا کہ ہندی سرکاری مرتبہ حاصل کرنے کے باوجود اردو کو اپنا مدمقابل سمجھتی رہی اور غیر ضروری مناقشات کھڑے ہوتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں یوپی کے وزیراعلیٰ پنڈت پرشوتم داس ٹنڈن نے ہندی کی حمایت کا دامن سنبھالا اور پرشوتم داس ٹنڈن کے ہمنوا پنڈت سمپورنا نند نے پریم چند کے حوالے سے کہا کہ پریم چند ہندی کے سب سے بڑے اور نمائندہ ادیب ہیں۔ اردو کے مشہور ممتاز شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے جواباً ''شاہراہ'' (دلی) میں مضمون لکھا کہ پریم چند دراصل اردو کے ادیب ہیں اور پریم چند کو پریم چند اردو نے بنایا ہے۔ انصاف پسند ہندو ادیبوں اور دانشوروں نے اردو کی حمایت کی۔ یہ دراصل لسانی اور سماجی انصاف پسندی تھی، کسی طرح کی جانبداری یا عصبیت کا اس میں دخل نہیں تھا۔

قصہ مختصر ان تمام حالات کے باوجود ادھر چند برسوں سے اردو کی قدامت اور آزادانہ لسانی شناخت کو ختم کرنے کے لیے جو کوششیں شروع ہوئیں ان میں پریم چند کے بیٹے امرت رائے کی کتاب ''A House Divided'' سرفہرست ہے جو تنگ نظری

اور لسانی عصبیت کی افسوسناک مثال ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین اردو کے نامور استاد اور محقق رہے ہیں، لیکن اردو زبان اور گنگا جمنی تہذیب سے مسلمانوں کو جوڑنے میں ان کا ذہن صاف نہیں رہا۔ وہ ذہنی انتشار کا شکار رہے ہیں۔ کبھی وہ اپنی مادری زبان اردو اور کبھی ہندی لکھاتے رہے۔ وہ گاندھیائی ہندوستانی کے منکر رہے ہیں، لیکن اپنے گزشتہ بیانات واعترافات کو بھول کر اپنی مادری زبان "ہندوستانی" بھی لکھوائی ہے۔ ان کی تحقیقی کتابوں "اردو کی نثری داستانیں" اور "شمالی ہندوستان کی اردو مثنویاں" میں ان کا یہ غیر صاف ذہن واضح طور پر جھلکتا ہے۔ "شمالی ہندوستان کی اردو مثنویاں" ڈاکٹر گیان چند جین کا ڈی۔ لٹ کا مقالہ ہے پہلی مرتبہ اس کے ممتحن ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی تھے، انہوں نے اس مقالہ پر سخت تنقید کی تھی اور رد (reject) کردیا تھا۔

ڈاکٹر گیان چند اردو اور مسلمانوں کے تعلق سے ہمیشہ ترچھی نظر سے دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔ انہوں نے زبان کا ایک بت تراشا ہوا ہے اور ایک مخصوص تنگ نظری ہی سے اردو کو دیکھتے رہے ہیں۔ زبان کے بارے میں لکھتے وقت تہذیبی وسماجی سیاق اور اسلوبیاتی جمالیات کو جو زبان کے اہم اجزا ہیں، وہ نظر انداز کرتے رہے۔ ڈاکٹر جین کی حالیہ کتاب "ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب" اسی چشم حسود اور تنگ نظری کی آئینہ داری کرتی ہے۔

"ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب" ایک ایسی کتاب ہے کہ جس کو پڑھنے کے بعد علمی روشنی نہیں حاصل ہوتی بلکہ وہ ایک اندھا کنواں بن جاتی ہے۔ علمی مسائل پر علمی انداز سے گفتگو یقیناً کی جاسکتی ہے اور اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن علم کو تنگ نظری اور تعصب کی آنکھ سے دیکھا جائے، جس سے نفرت کی بو آتی ہو تو ایسی کتابیں قابل نفریں بن جاتی ہیں۔ پھر موضوع سے ہٹ کے اپنی غیر مستند معلومات کو فرقہ وارانہ رنگ دے کے افسانوی انداز سے پیش کیا جائے تو پھر علم اور بے علمی کے درمیان باریک لکیر

کھینچنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی گفتگو تحقیق سے زیادہ افسانہ بن جاتی ہے۔ مطالعہ اور معلومات کو منفی انداز سے نہیں بلکہ مثبت انداز نظر سے پیش کیا جانا چاہیے۔ معلومات اور علم کو سماج میں دراڑیں ڈالنے اور دیواریں کھڑی کرنے کے مقاصد یقیناً مضر ہیں۔ اساتذہ اور عالموں کا مقصد، فرقہ پرستی کے اس دور میں جو ہمارے سماج کو کھائے جا رہا ہے، یہ ہونا چاہیے کہ دیواریں تعمیر کرنے کی بجائے پل تعمیر کریں۔ افسوس ہے کہ محترم جین صاحب کی زیر نظر کتاب اس معیار اور مقصد سے کوسوں دور ہے۔

"ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب" ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی لیکن منظر عام پر ۲۰۰۶ء میں آئی۔ اس کی وجہ بظاہر سمجھ میں نہیں آئی یہ بات ایک سربستہ راز سے کم نہیں۔ ممتاز اردو محقق شمس الرحمٰن فاروقی کا بے لاگ تبصرہ، جو سبق اردو (بھدروہی) اور کتاب نما (نئی دلی) اور پھر اردو ادب (نئی دلی) میں شائع ہوا تو اس زہر سے اردو دنیا آشنا ہوئی۔ اہل اردو کے پیٹھ میں یہ ایک وار تھا اس وار کے لیے کم از کم انہیں پروفیسر گیان چند جین سے اگرچہ ان کے تیکھے جملے سننے اور پڑھنے کے وہ عادی تھے، توقع نہ تھی، اس عالم و محقق سے جسے اردو والوں نے ان کی تمام تر کمزوریوں کے باوجود دل میں بٹھایا تھا اور عزت و احترام بھی دیا اور انعام و اکرام اور توصیف ناموں سے بھی نوازا۔ اب بھی وہ اپنی سابقہ اردو کی علمی و ادبی خدمات کے لیے اہل اردو کے لیے قابل احترام ہیں۔

گیان چند جین صاحب کی یہ کتاب پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سالہا سال سے ڈھکے چھپے طریقے سے وہ قطرہ قطرہ زہر جمع کر رہے تھے۔ شاگردوں سے گفتگو، معاصرین سے مکالمہ برسوں کرتے رہے ہوں گے۔ غیر سنجیدہ گفتگو کے نوٹ لیے ہوں گے تب اس کے بعد یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ ان کی ساری غلط بیانیوں کا جواب دینے کے لیے دو ایک سال کا عرصہ ضروری ہے، مگر دوستوں کے اصرار پر صرف تین ماہ کے مختصر عرصہ میں اس کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ تنگی وقت کی وجہ سے سارے اعتراضات کے جواب اس کتاب میں شامل نہیں ہیں۔ کتاب کا مقصد، جواب سے

زیادہ غلط بیانیوں کو لسانیات اور تاریخ کے حوالے سے رد کر کے اسے دستاویزی بناتا ہے، تا کہ آئندہ کوئی قاری اس کتاب، ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' سے گمراہ نہ ہو اور اردو اور ہندی کے تعلق سے حقیقت پسندانہ معلومات اس کے پیش نظر رہیں۔ اس کتاب کے بنیادی نتائج یہ ہیں:

۱۔ اردو اور ہندی میں توضیحی لسانیات کے اعتبار سے مماثلت ہونے کے باوجود ان دونوں میں صوتی، لفظی اور صرفی امتیازات ہیں۔ اسی طرح سماجی لسانیات، اسلوبیات اور لسانی جمالیات کے اعتبار سے یہ دونوں الگ الگ دو زبانیں ہیں۔

۲۔ قدامت کے اعتبار سے اردو کو اولیت حاصل ہے جس کا صدیوں سے تاریخی تقاضوں کے تحت فطری ارتقا ہوا ہے۔ انگریز مستشرقین کے علاوہ سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر تارا چند، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور آخر میں ممتاز عالم اور ماہر لسانیات پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی اور ہندی کے متعدد عالم اور محقق بھی اردو کو اصل زبان مانتے ہیں۔ ہندی، ہندوی، ریختہ، دکنی، گجری اور اردو ایک ہی زبان کے مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ غالبؔ کے خطوط ''اردوئے معلی'' اور ''عود ہندی'' اس کی مثال ہیں۔

۳۔ جدید ہندی کا بیج فورٹ ولیم کالج میں بویا گیا اور ۱۸۵۰ء کے بعد اسے ترقی حاصل ہوئی۔ جس کا مقصد سیاسی بھی تھا اور مذہبی بھی۔ اردو کو سنسکرت آمیز کر کے جدید ہندی کی تحریک للو لال جی کے بعد بنگال اور پنجاب میں نوین چندر رائے اور دیانند سرسوتی نے شروع کی تھی جس کی بنیاد کٹر مذہب پرستی تھی۔

۴۔ اودھی، برج، میتھلی اور راجستھانی وغیرہ زبانیں آزاد اور ترقی یافتہ ادبی زبانیں ہیں اور ہندی یا اردو سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پروفیسر گیان چند کے اس سلسلے کے سارے انکشافات محض افسانوی حیثیت رکھتے ہیں اور لسانی استحصال پسندی کی مثال ہیں۔

۵۔ کرسٹوفر کنگ کی کتاب One Language Two Scripts اور پروفیسر جین کی کتاب میں صرف نام کی مشابہت ہے اور دونوں کا موضوع الگ ہے، اگرچہ اس کا نام گمراہ کن ہے۔

۶۔ چند مسلم حکمرانوں کے ناروا سلوک کے باوجود عام مسلم حکمراں روادار، انصاف پسند اور غیر متعصب تھے۔ بابر کی ہمایوں کے نام وصیت کے علاوہ اورنگ زیب کی مذہبی رواداری اور انصاف پسندی بھی بے مثال ہے جس نے ہندو مندروں کی ہی نہیں بلکہ جینی عالموں اور مندروں کی بھی مالی اعانت کی اور انہیں جائیدادوں سے نوازا۔ گیان چند جین صاحب ان تاریخی حقائق کا مطالعہ نہیں کر سکے۔ ہندوؤں کے مذہبی معتقدات کے بارے میں مرزا مظہر جان جاناں کے افکار سے صوفیا کے عقائد اور ہندو مت کے لیے احترام بھی واضح ہو جاتا ہے۔ گیان چند جین اس مثبت فکر کا مطالعہ نہیں کر سکے۔

۷۔ اہل اردو نے مذہب کی تخصیص کے بغیر سارے اردو ادیبوں اور شاعروں کو عزت و احترام اور اعلیٰ مناصب سے نوازا۔ بیسویں صدی میں پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت درگا پرساد سرور، پنڈت دتاتریہ کیفی، پریم چند، مالک رام، جگن ناتھ آزاد، تلوک چند محروم، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، آنند نرائن ملا، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، گیان چند جین، اور گوپی چند نارنگ وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے، جو اردو والوں کی آنکھ کا نور اور دل کے سرور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کالی داس رضا گپتا کے خدمت گزاروں میں ان کے بیشتر شاگرد اور دوست مسلمان ہی تھے۔ پنڈت کنزرو اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ انجمن ترقی اردو (ہند) دلی کے صدر رہ چکے ہیں۔

محترم گیان چند صاحب کی کتاب پر سب سے پہلا وقیع تبصرہ جناب شمس الرحمن فاروقی کا تھا۔ پھر اگست ۲۰۰۶ء کے "معارف" (اعظم گڑھ) میں جناب عبدالقدیر

صاحب نے انتہائی دروں بینی کے ساتھ متوازن تبصرہ کیا جو حیدرآباد سے شائع ہونے والے موقر روز نامہ ''منصف'' میں بھی شائع ہوا۔ ایک اہم مفصل تبصرہ نما عالمانہ مقالہ ''اردو زبان فرقہ پرستی کے تناظر میں'' پروفیسر مرزا خلیل بیگ (پروفیسر لسانیات) شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے لکھا جو قومی آواز لکھنو میں ۲۶ ستمبر تا ۵ا اکتوبر ۲۰۰۶ء آٹھ قسطوں میں شائع ہوا جس میں متوازن اور علمی انداز سے جین صاحب کے گمراہ کن فرمودات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند، دلی کے موقر رسالے اردو ادب میں ڈاکٹر اسلم پرویز اور پروفیسر شمیم حنفی نے بھی اس مسئلہ پر علمی انداز سے گفتگو کی۔ اسلم پرویز لسانیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں، ان کے مضمون نے مختلف گوشوں سے جین صاحب کی مسموم تحریر کا علمی جائزہ لیا۔ اس رسالے کی ایک اہم ترین خصوصیت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کا ۲۳ صفحات پر مشتمل جین صاحب کی کتاب پر مفصل مقدمہ ہے، جسے انہوں نے پانچ صفحات میں تلخیص کے ساتھ شائع کیا جو علمی بددیانتی کا شاہکار ہے۔ سنیتی کمار چٹرجی کی آخری حتمی رائے سے اغماض برتنا اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے طویل مقدمہ کو حسب مطلب پانچ صفحات میں شائع کرنا، کسی بھی محقق و ادیب کو نامعتبر بنا دیتا ہے اور اس کے علمی و تحقیقی اخلاقیات کے بلند بانگ دعوے چشم زدن میں ریت کی دیوار بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے جس اطمینان، فرصت اور احباب اور شاگردوں کے تعاون سے یہ کتاب لکھی ہے وہ اطمینان، فرصت اور تعاون راقم الحروف کو حاصل نہیں تھا اور نہ ہی مسودہ صاف کرنے کے لیے کوئی شاگرد عزیز میسر تھا۔ میں نے یہ کتاب حیدرآباد یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر شپ کے قیام کے زمانے میں جولائی تا ا اکتوبر ۲۰۰۶ء کے مختصر عرصہ میں لکھی ہے اور چند بنیادی باتوں کو ہی موضوع بحث بناتے ہوئے اردو کا مقدمہ پیش کیا اور تاریخی فرقہ واریت کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اور بھی کئی باتیں جواب طلب ہیں، مگر فوری طور پر حاصل فکر یہی ہے جو اردو قارئین کی خدمت میں

پیش ہے۔ اس توقع کے ساتھ کہ وہ اردو اور ہندی، دو آزاد زبانوں کا لسانی اور سماجی انصاف پسند کے ساتھ دل سے احترام کریں گے۔ اردو، ہندی اور دیگر ساری ہندوستانی زبانیں ہمارا قومی تہذیبی سرمایہ ہیں اور ان سب کے ادب سے حسب استطاعت ہمیں فیضیاب ہونا ہے۔" خذ ما صفا ودع ما کدر"......

زبانوں کا مطالعہ جزئیات کے اعتبار سے نہیں بلکہ 'کل' کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اردو کو وسیع لسانی پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ زبان کے تہذیبی پہلو، لسانی آداب، رسم الخط اور ادب زبانوں کے لاینفک اجزا ہیں اور ان سے 'کل' کا تصور قائم ہے۔ محض ایک جز یعنی توضیحی لسانیات یا جملے کی قواعدی ساخت میں مشابہت یا یکسانیت کی بنیاد پر 'دو زبانوں' پر 'ایک زبان' ہونے کی بات کلی طور پر غلط ہے۔ ماہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادبی اسالیب اور شعری نزاکتوں اور رسم الخط کو فراموش نہ کرے۔ مشہور ماہر لسانیات پھمن خوب چندانی کے بقول:

> "Considering the literary trends, writing systems and the pressure of language-elites, there can be no doubt about treating Hindi and Urdu as two distinct language 'institutions'. But when taking into account the structural characteristics of these two 'literary languages', linguists regard Hindi-Urdu as a single grammatical system.

دو الگ الگ زبانیں ہونا اور دو زبانوں کی ایک قواعدی ساخت ہونا اس میں بعد المشرقین ہے۔ جہاں تک عام بول چال کی 'ہندوستانی' کا سوال ہے وہ بنیادی طور پر اردو ہی کا مترادف ہے یہ اردو کا عوامی اسلوب (سطح) ہے۔

اردو ہندو اور مسلمانوں کا تہذیبی ورثہ ہے۔ یہ ایک مشترک قومی میراث ہے

جیسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اور اسی طرح سکھوں، زرتشتیوں اور عیسائیوں نے اپنے خون سے سینچا اور اردو رسم الخط ہی میں سنوارا۔ ادبی اعتبار ہی سے نہیں خالص مذہبی لحاظ سے بھی یہ سارے ہندوستانیوں کی مذہبی میراث رہی ہے۔ ہندو مذہب کے سارے مذہبی صحائف کے ترجمے اس میں محفوظ ہیں۔ ہندو مذہب کی ترویج و اشاعت میں اس نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ اسی طرح اسلامی ادب کی اشاعت میں بھی اس کا اہم کردار رہا ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی کی طرح وید، اپنشد، پُران، رامائن، مہابھارت کے کثیر ترجمے اور اسی طرح گیتا کے بے شمار ترجمے اردو میں محفوظ ہیں جو ہندوؤں کی مذہبی ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ قدیم ہندوستانی قصے اور کہانیاں اور اعلیٰ ادبی فن پارے بھی اس میں ترجمہ ہو کر محفوظ ہوئے ہیں۔ گروگرنتھ اور اسی نوعیت کی کئی کتابیں بھی اردو زبان و ادب کا سرمایہ ہیں۔ ان سے اردو زبان کی وسعت، وسیع المشربی، قومی ضروریات کا احساس اور ان کے احترام پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ وسعت ماضی میں دوسری ہندوستانی زبانوں میں نہیں تھی۔ ڈاکٹر عزیز، علی جواد زیدی، رام لعل نابھوی اور ڈاکٹر صاحب علی نے رامائن، مہابھارت اور گیتا کے بے شمار اردو ترجموں کی نشاندہی کی ہے۔ مترجمین میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ ہندی اس کے برعکس صرف ہندو مذہب اور تہذیب کی علامت ہے۔

گیان چند جین نے عہد وسطیٰ کی تاریخ کے حوالے سے مسلمانوں پر خوب وار کیے ہیں۔ اس تعلق سے وہ الگ دوسری کتاب لکھ سکتے تھے، مجبوراً زیر نظر کتاب میں 'گیان چند کی فرقہ وارانہ تاریخ' پر بھی سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں چند تاریخی حوالوں کے سلسلہ میں مجھے معروف محقق اور ادیب ڈاکٹر رشید موسوی کا تعاون حاصل رہا۔ میں اس نوازش کے لیے ان کا شکرگزار ہوں۔ کتاب کی طباعت کی ساری ذمہ داری اور آرائش کے لیے میرے دوست اور 'شگوفہ' (حیدرآباد) کے مدیر و محقق ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اور عزیزی جاوید یوسف (ممبئی) کا

ممنون ہوں جنہیں نے کتاب کا سرورق بنایا۔ میں شعبہ اردو، حیدر آباد یونیورسٹی کے اساتذہ پروفیسر محمد انوارالدین (صدر شعبہ اردو) اور پروفیسر مظفر شہ میری کے علمی تعاون کے لیے بھی ان کا شکر گزار ہوں۔ میں یونیورسٹی آف حیدرآباد کے ارباب حل وعقد کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مجھے مدعو کرکے نہ صرف میری عزت افزائی کی بلکہ فراغت وسکون کے لحات میں ایک علمی کام کرنے کا بھی موقع عنایت فرمایا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب جو ڈاکٹر گیان چند کی کتاب کے رد اور جواب (Rejoinder) کے طور پر لکھی گئی ہے اردو اور دیگر علمی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

عبدالستار دلوی

۱۵ نومبر ۲۰۰۶ء

شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد

پہلا باب

تمہید

ڈاکٹر گیان چند اردو کے مشہور محقق اور ماہر لسانیات ہیں۔ ان کی کتابیں اردو تحقیق کا اہم سرمایہ ہیں جن میں انہوں نے اردو زبان و ادب کے مختلف موضوعات پر عالمانہ اظہار خیال کیا ہے۔ ''اردو کی نثری داستانیں'' اور ''شمالی ہندوستان کی اردو مثنویاں'' ان کے گراں قدر تحقیقی مقالے ہیں، جن کی حوالہ جاتی اہمیت ہے۔ دوسری کتابیں جو متفرق موضوعات پر مضامین کے مجموعے ہیں اردو تحقیق و تنقید اور لسانیات میں رہنمایانہ کتابوں کی ذیل میں آتی ہیں۔ فن تحقیق پر ان کی کتاب اصول تحقیق سے متعلق سیر حاصل کتاب ہے، اسی طرح ''عام لسانیات'' پر ان کی کتاب انگریزی کتابوں کے حوالے سے لسانیات پر ایک اہم کتاب ہے، جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری کی کتابوں پر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر گیان جین میرے محترم کرم فرما ہیں اور ان کی شفقتیں میرے شامل حال رہی ہیں۔ گیان چند صاحب کی تحریروں سے میں نے ہمیشہ استفادہ کیا ہے۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۲ء میں کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں سمر سکول آف لنگوسٹکس میں ہوئی۔ میرا لسانیات سے یہ پہلا تعارف تھا جبکہ جین صاحب اس سے ایک سال قبل ساگر میں بھی سمر سکول میں شریک تھے۔ پروفیسر اے۔ ایم۔ گھاڈگے، پروفیسر اشوک کیلکر، پروفیسر لکشمن کھوبچندانی، پروفیسر میہندلے وغیرہ ہمارے اساتذہ تھے۔ اس لحاظ

سے جین صاحب اور میں خوب تاش ہوئے۔ اس موقع پر افسوس کے ساتھ میں یہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ اردو کے اساتذہ اور طلبا نے ہمیشہ لسانیات کو نظر انداز کیا، ان سمر سکولوں میں جو مختلف یونیورسٹیوں میں ہوتے تھے، اردو کے طالب علم کم ہی ہوتے تھے۔ دھارواڑ میں اردو کی نمائندگی کرنے والے لسانیات کے طالب علم ہم دو ہی تھے، گیان چند اور میں۔ بعد میں بھی کئی سمر سکولوں میں شریک رہا، مگر اردو والوں کی نمائندگی نہیں کے برابر یا سب سے کم رہی۔ جین صاحب دھارواڑ سے بمبئی بھی تشریف لائے تھے اور تین روز میرے مہمان رہے، یہ میرے لیے سعادت کی بات ہے۔ پھر میں چند ماہ بعد سکول آف اورینٹل سٹڈیز میں لسانیات اور صوتیات میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گیا۔ اس زمانے میں جین صاحب سے مستقل خط و کتابت کا شرف حاصل رہا اور خط و کتابت اور ملاقاتوں کا سلسلہ ۲۰۰۲ء تک رہا۔ اس بار وہ امریکہ سے ہندوستان آئے تھے اور بمبئی میں اپنی بھتیجی کے ہاں اندھیری میں مقیم تھے (اس موقع کی گفتگو کا ذکر بعد میں آئے گا)۔

گیان چند جین صاحب کی تازہ تصنیف "ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب" لسانیات پر ان کی دوسری کتاب ہے۔ اس کتاب کی اشاعت نے اہل اردو کو ششدر اور حیران رکھا ہے کہ انہوں نے اپنی ساری عمر اردو کی تدریس و تحقیق میں گزاری، حمیدیہ کالج، بھوپال، الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور پھر حیدرآباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں درس و تدریس اور تحقیق و تنقید کے بعد، اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ اردو دشمن کتاب کیوں کر لکھی؟

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

جین صاحب نے اس کتاب کی "تمہید" میں لکھا ہے کہ ان کی "کتاب کا موضوع خاصا دلچسپ اور علمی انداز کا ہے۔ لیکن اختلافی ہے"...... میرا خیال ہے کہ یہ موضوع دلچسپ بھی ہے اور اختلافی بھی، لیکن علمی انداز کا ہرگز نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اختلافات

غیر علمی ہونے کی وجہ سے، ان پر گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے، تاکہ علمی مباحث زیر بحث آجائیں اور مکالمہ خالص علمی انداز سے جاری رہے۔ جین صاحب نے لکھا ہے کہ انہیں "یہ کتاب لکھنے کی ضرورت پیش آئی اور "یہ کہ یہ دکھ کا شجر" ہے۔ کتاب لکھنے کی ضرورت پیش آنا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن انہوں نے اپنی اس کتاب کو دکھ کے شجر سے تعبیر کیا ہے۔ یہ دکھ کا شجر برسوں بعد لگانے کی ضرورت آج کیوں پیش آئی؟ غالباً یہ کام ایک منصوبہ بند طریقے سے کیا گیا ہے۔ دکھ کے اس شجر پر مرہم بہر حال لگاتا ہے، لیکن ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کاش یہ محبت کا پودا ہوتا۔ محبت سے دنیا کو فتح کیا جاسکتا ہے۔ یہ دکھ جس کا ذکر گیان چند صاحب کر رہے ہے، اصل دکھ نہیں ہے، یہ دکھ اوڑھا گیا ہے۔ دکھ کا علاج دکھ دینے سے نہیں ہوتا مرہم رکھنے سے ہوتا ہے، محبت سے ہوتا ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ گلے شکوے تو زندگی میں ہوتے ہی ہیں، لیکن شکوے شکایت سے درد کم نہیں ہوتا، دکھ مل بانٹ کر ہلکا کیا جاتا ہے۔ جین صاحب اسے بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ جین صاحب نے بہر حال یہ کتاب لکھی، اچھا کیا، لیکن بہت اچھا کرتے اگر یہ کتاب وہ دوران ملازمت لکھتے۔ ویسے اس دکھ کے شجر کا بیج ان کے پاس برسوں سے تھا، اس کا اندازہ مجھے برسوں پہلے ہوا تھا جب انہوں نے "ہماری زبان" (انجمن ترقی اردو، دلی) میں "مرحوم" اور "آنجہانی" کی بحث اٹھائی تھی۔ ظاہر ہے یہ بحث لایعنی تھی لیکن تھی خطرناک۔ اس لیے کہ اسی شگوفہ یعنی "آنجہانی" اور "مرحوم" سے یہ "دکھ کا شجر" تناور ہوا۔ جین صاحب نے ماہرین لسانیات سے لسانیات کا علم حاصل کیا ہے۔ شاید انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر زبان کی پرتیں ہوتی ہیں اور آنجہانی، ایشور، پرماتما، دھرم، اپواس، پرارتھنا، بھگوان اور مرحوم، اللہ، خدا، رب، مذہب، نماز، عبادت، فرشتہ جیسے الفاظ ہر زبان کی تہذیبی لفظیات (Cultural Vocabulary) ہوتے ہیں۔ مشہور ماہر لسانیات بلکہ جدید لسانیات کے ابوالآباد بلوم فیلڈ (Edward Bloomfield) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب Language میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ ایسا کون سا دکھ ہے، جس کا

بے دردی سے ذکر کیا گیا ہے؟ جین صاحب محترم نے "جذبہ وفکر کو دھچکوں کا جو سامنا کرنا پڑا اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ جذبہ وفکر اور دھچکے لگنا انسانی زندگی کے معمولات میں سے ہے، اس سے کسی کو مفر نہیں۔ یہ زندگی کی کشمکشوں کا ایک پہلو ہے، جس سے انسان گزرتا ہے، ذاتیاں، برادریاں اور قومیں گزرتی ہیں، ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا جاتا ہے، آنسو بہانے سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ جذبہ وفکر کے دھچکے ہندوؤں کو بھی لگتے ہیں اور مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں کو بھی، اردو والوں کو بھی اس سے گزرنا پڑتا ہے اور ہندی والوں کو بھی ...... مراٹھی والوں کو بھی اور کنٹر والوں کو بھی۔ ۱۹۶۵ء میں ہندی اور تامل کے نام پر جو فسادات ہوئے، اس کا دکھ صرف ہندی اور تامل والوں ہی کو نہیں ہوا، اردو والے اس پر خوش نہیں ہوئے۔ انہیں بھی دکھ ہوا، سارے ہندوستان کو دکھ ہوا۔ لسانی اور مذہبی وتہذیبی اقلیتوں کو جذبہ وفکر کے یہ دھچکے، زیادہ جھیلنے پڑے ہیں۔

جین صاحب کا یہ بڑپن ہے کہ وہ یہ آزادی دیتے ہیں کہ لوگ اپنے اپنے خیالات پر قائم رہیں، انہیں جین صاحب کا ہم نوا بننے کی ضرورت نہیں۔ سب کو اپنے اپنے عقیدوں اور نظریات پر قائم رکھنے کا حق ہے۔ اسی حق کا استعمال کرتے ہوئے جین صاحب کے فرمودات پر چند معروضات پیش کرنے کی یہ میری جسارت ہے۔ جین صاحب فرماتے ہیں کہ "اہل علم کی وفاداری صرف سچ سے ہوتی ہے" ...... یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ تحقیق چاہے ادبی ہو چاہے لسانی اور تاریخی ہو، اس کا بنیادی کام سچ کی تلاش ہے۔ لیکن یہاں مجھے ڈر ہے کہ جین صاحب نے جو دکھ کی چادر اوڑھ رکھی ہے، وہ انہیں سچ سے بہت دور کر دیتی ہے اور سچ کی تلاش میں وہ گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے تمہیدی کلمات میں پھر لکھتے ہیں کہ "یہ بالکل ضروری نہیں کہ ہم اردو ادب کے خمیر سے بنائے گئے ہیں تو ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اردو ادب کو ہندی کا پیشرو قرار دیں یا اردو بولنے والوں کی تعداد ہندی بولنے والوں سے بڑھا چڑھا کر بیان کریں، مگر افسوس کہ ہوتا یہی آیا ہے۔" مجھے افسوس کہ جین صاحب یہاں بھی سچائی کی تلاش میں گمراہی کے راستے پر

گامزن ہیں۔ جس ادب کو وہ اردو ادب کا پیشرو کہنا چاہتے ہیں حقیقتاً وہ اردو کا پیش رو نہیں ہے۔ یہاں اردو یا ہندی کے خمیر سے اٹھنے کی بات نہیں ہے، غیر جانبدار ہونے کی بات ہے اور ان کا جو رجحان ہے وہ غیر جانبداری کا رجحان نہیں ہے۔ جین صاحب نے خود اپنی کتاب میں رام چندر شکل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ کھڑی بولی کا ادبی اسلوب جو پہلے نمودار ہوا وہ اردو اسلوب میں سامنے آیا۔ گریرسن نے بھی ادبی اردو کو ہندی کا پیش رو کہا ہے۔ چٹرجی بھی جو کبھی اردو سے ناراض تھے، اپنی عمر کے آخری حصہ میں اردو کے قائل ہو گئے تھے اور اردو کو اصل زبان مانتے تھے۔ جین صاحب چٹرجی کی علمی حیثیت کے تو معترف ہوں گے:

معترف کون نہیں میر کی استادی کا

لیکن امرت رائے ہوں یا گیان چند، چٹرجی کی اس فیصلہ کن رائے سے کنی کاٹ جاتے ہیں۔ جین صاحب! یہ سچائی تلاش کرنے کا راستہ نہیں، یہ بددیانتی کی شاہراہ ہے جو آپ نے اختیار کی ہے (اس پر تفصیلی گفتگو بعد میں کی جائے گی)۔ جہاں تک اردو اور ہندی بولنے والوں کی تعداد کی کمی یا زیادتی کا سوال ہے یہ مسئلہ اتنا واضح یا صاف نہیں ہے۔ یہ مکھن کی ملائم راہ نہیں ہے۔ راستے میں چھوٹے بڑے پتھر ہیں، اس کا فیصلہ کرنا جین یا کسی امرت رائے کے لیے مشکل تر کام ہے۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندوستانی / اردو جو مترادفات کی حیثیت رکھتے ہیں، ہندوستان کی رابطہ اور عام ابلاغ و ترسیل کی زبان تھی۔ یہ ایک کثیر لسانی سماج میں جوڑنے والی زبان (Link Language) یا رابطے کی زبان یا لنگوا فرانکا (Lingua Franca) تھی۔ بہت زیادہ حوالے دینے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ ماہرین نے چاہے وہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں، پارسی ہوں یا عیسائی اس بات کا اپنی تحریروں میں ذکر کیا ہے۔ اس ہندی یعنی This Hindi کا آغاز تو بھارتیندو ہرش چندر کے ساتھ ہوا اور ایک بڑی سرکاری طاقت کے باوجود اسے آج تک جنوبی ہندوستان میں قبولیت حاصل نہیں ہے۔ کرناٹک اور تمل ناڈو میں، میں یہ مشاہدہ

کر چکا ہوں کہ مہمان خانوں کے معمولی ملازمین بھی ہندی کا ایک لفظ اپنی زبان سے ادا کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اردو کو بھی ہندی سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں، ہاں، انگریزی میں جواب دیتے ہیں...... جین صاحب اگر ہندی بولنے والوں کی تعداد بڑھانے کی بات کرتے ہوں تو میں یہ کہوں گا کہ وہ برج، اودھی، میتھلی، بھوجپوری وغیرہ کو ہندی میں شامل نہ کریں۔ یہ آزاد زبانیں ہیں جو اب ہندی میں شامل کی گئی ہیں اور ان کی حیثیت اور شناخت ختم کردی گئی ہے۔ ہندی اردو کا ایک زیریں لہجہ "ہندوستانی" کا بھی ہے۔ جس کا مجموعی لسانی رجحان اردو ہی کی جانب ہے اور یہی زبان عام بول چال کی زبان ہے جس میں سنسکرت، فارسی رعربی اور انگریزی کے الفاظ آسانی سے سما جاتے ہیں۔ اسی زبان نما بولی کو چینی اور انگریزی کے بعد دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کہا جاتا ہے اور اس کا نام "ہندوستانی" ہے۔

گیان چند جین لکھتے ہیں کہ "اردو میں زبان کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں اور ہندی میں لکھی جانے والی کتابیں ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں" ...... جین صاحب کا یہ خیال نیم سچائی ہے، مکمل سچائی نہیں ہے۔ اردو زبان کے موضوع پر ابتداً انگریز سکالروں نے خامہ فرسائی کی، کیلگر کی ہندوستانی گرامر ہو، چاہے گلکرسٹ، پلیٹس اور فوربس کی قواعد کی کتابیں ہوں یا اردو املا کے مسائل اور اعراب ہوں، یہ سب انگریزوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ ہاں اردو شعرا کے تذکرے اکثر مسلمان عالموں نے لکھے، اور ایک تذکرہ لچھمی نرائن شفیق نے بھی لکھا ہے۔ لیکن ۱۸۳۰ء کے بعد تک گارساں دتاسی کی تاریخ ادب اردو و ہندی یا ان کے متعدد گرامر اور عروض پر رسالے یا ان کے اردو اور ہندی پر خطبات کو تو مسلمان اور ہندو نقطۂ نظر نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ۱۸۵۰ء کے بعد جب فورٹ ولیم کی پشت پناہی میں ہندی تحریک نے زور پکڑا، جس کے اگووا یا پیشرو بھارتیندو ہرش چندر اور راجا شیو پرساد، ستارہ ہند تھے تو ہندی والوں میں ہندویت کا احساس فروغ پایا اور ہندی کا نشو ونما ہوا اور ہندی کے بارے میں جو کچھ لکھا

جانے لگا وہ ہندو نقطہ نظر تھا۔ اردو کا ہندی کے مقابلہ میں "ہندوستانی نقطہ نظر" تھا۔ اس میں اسلام کی کارفرمائی بھی تھی اور ہندو دھرم کی بھی۔ اردو میں فارسی عربی کے کثیر الفاظ مذہبی نقطہ نظر سے نہیں آئے تھے یہ تاریخی تقاضے کے تحت آئے تھے۔ گیان چند صاحب کو یاد ہوگا کہ "آب حیات" میں شمس العلماء محمد حسین آزاد نے اردو میں ایرانی تہذیبی اثرات کی زیادتی پر تنقید بھی کی تھی۔

جین صاحب کو شاید یہ بھی یاد ہوگا کہ اردو کی باقاعدہ پہلی ادبی تاریخ رام بابو سکسینہ نے انگریزی میں لکھی تھی۔ کیا ان کا نقطہ نظر مسلمانی نقطہ نظر تھا؟ انگریزی ہی میں دوسری تاریخ ادب اردو لندن یونیورسٹی کے اردو کے استاد گراہم بیلی (T.Graham Belly) نے لکھی تھی جو انگریز تھے۔ جرنل آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز اور دیگر معتبر و مستند جرائد میں اردو پر مضامین مسلمانی نقطہ نظر سے نہیں لکھے گئے ہیں، علمی نقطہ نظر سے لکھے گئے ہیں، جس سے اتفاق بھی کیا جاسکتا ہے اور اختلاف بھی۔ ہندی کے بارے میں جین صاحب کا بیان غالباً صحیح ہے کہ ہندی کی ابتدا اور اس کی اشاعت صرف اور صرف "ہندی، ہندو ہندوستان" کے تنگ نظر نقطہ نظر کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئی۔ اردو، ہندی، ہندوستانی، ریختہ، ہمیشہ ایک ہی زبان کے مختلف نام یا مترادفات رہے ہیں۔ غالب اردو کا عظیم ترین شاعر ہے۔ جین صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں، مگر غالب نے اپنی زبان کو ریختہ بھی کہا ہے اور ان کے خطوط کے دو مجموعے "اردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" کے نام سے شائع ہوئے اور مقبول خاص و عام ہوئے۔ ہاں جدید ہندی یا بقول رام گوپال "یہ ہندی...... This Hindi"، ہندوستان کو مشترکہ تہذیب کی نہیں بلکہ ہندو احیائیت Hindi revivalism کا تحفہ ہے، جو برگ و بار لایا، جس سے "ہندوستانی قوم پرستی" (Indian Nationalism) کی بجائے "ہندی قوم پرستی" Hindi Nationalism کو فروغ حاصل ہوا۔(۱)

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھئے۔ ہندی نیشنلزم، الوک رائے (Hindi Nationalism by Alok Rai) اورینٹ لانگ مین ۲۰۰۱ء

(اس نقطہ پر اظہار رائے بعد کے صفحات میں ہوگا)۔ ہر روز، عیسائی، پارسی یا ..... سکھ کو انسانیت اور علم کے دائرے میں رہ کر ہندو یا مسلمان یا عیسائی سکھ یا پارسی ضرور رہنا چاہیے بلکہ وہ ہوتا ہے، ورنہ وہ انسان کیسے ہوسکتا ہے، فرشتہ بن جائے گا، اپنی لسانی شناخت (Linguistic Identity) اگر کچھ لوگ چاہیں کہ This Hind سے ہو تو انہیں اس کا حق حاصل ہے۔ میں تو ہمیشہ اس بات کا قائل رہا ہوں کہ ہماری ساری زبانیں، یورپ کی زبانوں کی طرح ادبی اعتبار سے بہت ثروت مند ہیں۔ ہم فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور روسی جیسی دیگر زبانوں میں جو دلچسپی دکھاتے ہیں، وہی دلچسپی ہندوستانی زبانوں میں بھی دکھائیں تو ہماری ذہنی کھڑکیاں کھل جائیں۔ اردو اور ہندی والوں کو اپنی لسانی عصبیت اور احساس برتری سے نکل کر دوسری علاقائی زبانوں سے ربط ضبط اور میل جول بڑھانا چاہیے۔ اردو والوں کو ہندی اور ہندی والوں کو اردو سیکھنی چاہیے۔ میں ان دونوں زبانوں کو ایک بھاشا نہیں مانتا بلکہ دو الگ الگ زبانیں مانتا ہوں۔ لیکن ان دونوں زبانوں میں لسانی سطح پر جو مماثلت ہے اس کا استقبال کرتے ہوئے دو ادبی فکری دھارے جو رواں دواں ہیں انہیں اردو اور ہندی کے لیے مددگار Complimentary سمجھتا ہوں۔ ہندی کی تاریخی کتابیں اگر ہندوؤں کے نقطہ نظر سے لکھی بھی گئی ہوں تو اس کا انہیں حق ہے کہ یہ خصوصاً ہندوؤں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ ہندی کا سارا ادبی سرمایہ ہندو مذہب اور ہندو تہذیبی سرمایہ ہے۔ اردو کا ادبی ورثہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی وراثت کا سرمایہ ہے۔ اسی لیے اس میں اذان بھی ہوتی ہے، ناقوس بھی بجتے ہیں جینیوں اور سکھوں بھی ہیں، دجلہ و فرات بھی ہیں اور گنگا جمنا، نرمدا، ساوتری اور کاویری جیسے دریا بھی ہیں۔ کوہ الوند بھی ہے، ہمالہ کی سربہ فلک چوٹیاں بھی ہیں اور سہیادری اور ست پڑا کے پہاڑی سلسلے بھی ہیں۔ محمدؐ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ جیسے پیغمبر بھی ہیں تو دوسری طرف رام، کرشن، لچھمن، گرونانک، سیتا اور ساوتری بھی ہیں۔ اس موضوع پر اردو میں کافی تحقیقی کام ہوا ہے۔ ڈاکٹورل تھیسس کے علاوہ ہندوستانی تہذیب، طرز زندگی، مندر و مسجد، دریا اور

پہاڑ، فن مصوری اور فن تعمیر سے متعلق منظوم انتخاب اردو کے مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر نے ''ہندوستان ہمارا'' کے عنوان کے تحت اردو رسم الخط اور ناگری لپی میں دو جلدوں میں پیش کیا ہے۔ کیا ان حقائق سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے اور جب اردو کو شعوری طور سے مسلمانوں سے وابستہ کیا جاتا ہے تو مذکورہ حقائق کی روشنی میں یہ علمی جھوٹ ہے یا کلیتہ حقائق سے ناواقفیت کا اظہار ہے، جو سچ کی بازیافت کی بجائے غلط راہ پر ڈال دیتا ہے۔

امرت رائے اب گیان چند کی کمزوری بن گئے جن کی کتاب A House Divided اردو ہندی کے تعلق سے عظیم گمراہی کا سامان پیدا کرتی ہے۔ گیان چند جین اپنی اس کتاب میں عالم سے زیادہ سیاست دان ہیں۔ کس پارٹی اور کس فکر کے، اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ اس سے بحث کے طول کھینچنے کا اندیشہ ہے۔ علم اور ادب میں پیری اور مریدی نہیں ہوتی، اختلاف رائے کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔ جین صاحب امرت رائے کے مریدوں میں شامل دکھائی دیتے ہیں۔ کتاب کے انتساب سے لے کر اندرونی صفحات تک امرت رائے سے گیان چند صاحب کا یہ پیری و مریدی کا رشتہ قائم ہے اور ان کی مدح میں رطب اللسان۔ بقول گیان چند:

> ''ایک صالح مصنف امرت رائے ہے جو ہندی سے وابستہ ہونے کے باوجود ہر جگہ اہل ہندی کی چال سے نہیں چلتا، مثلاً ہندی ادب کے مورخ اپنی زبان وادب کو ساتویں آٹھویں صدی عیسوی سے شروع کرتے ہیں، امرت رائے گیارھویں صدی سے شروع کرتا ہے۔ آچاریہ رام چندر شکل نے ہندی ادب کے ویرگاتھا کال کی کتھا ۱۲ کتابوں میں لکھی تھی۔ امرت رائے نے ان میں سے ۱۰ کتابوں کو رد کردیا، باقی دو میں سے ایک پر شک کا نشان لگایا ہے۔ جدید دور میں وہ اردو ہندی کے سلسلے میں ایسا جسارت آمیز

بیان دیتے ہیں:

'جہاں تک اس نقطہ نظر کا خیال ہے جو اردو کو ہندی کی بولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے، یہ اوندھی کھوپڑی کی سوچ ہی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اردو ایک علیحدہ اور آزاد زبان ہے" (امرت رائے کی انگریزی کتاب ص ۲۸۷) "تقسیم ملک کے باعث یہ سمجھنا کہ اب ہندی کو شدت سے سنسکرت زدہ کر دیا جائے اور اردو کو عربی فارسی سے پاک کر دیا جائے، میرے نزدیک یہ غیر لسانی اور غلط رویہ ہے۔ (ایضاً ص ۲۸۶)

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بے خوفی سے اردو کے خلاف بھی لکھا ہے۔ یہی علمی انداز نظر بھی ہے"۔

امرت رائے ایک آدھ مرتبہ ہی ہندی والوں کی چال بھول گئے۔ (یہ کوئی سیاسی یا علمی مصلحت بھی ہو سکتی ہے) مگر وہ اپنی انگریزی کتاب میں اول تا آخر، اردو کے خلاف ہی لکھتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں اردو کے خلاف جو بھی مواد ہے وہ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جین صاحب ہی کا فراہم کردہ ہے۔ امرت رائے نے جین صاحب کی مدد کا اپنی کتاب میں اعتراف بھی کیا ہے اور شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ میں یہاں، یہ بھی بتا دوں کہ جب امرت رائے A House Divided لکھ رہے تھے تو انہوں نے جناب شانتی لال شاہ (ہندوستانی پرچار سبھا بمبئی) کے سکریٹری اور خود راقم الحروف سے بھی خط و کتابت کی تھی اور میں نے معتدبہ مواد فراہم کیا تھا جو اردو کے حق میں تھا، لیکن ہندی کے خلاف نہیں تھا۔ میں اس زمانے میں پرچار سبھا کے ادارے میں، جو گاندھی جی کے ہندوستانی کے تصور کے فروغ کے لیے قائم ہوا تھا "مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری" کا بانی ڈائریکٹر تھا۔ اسی زمانے میں ہندوستانی لسانیت کے بے بدل عالم ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے خطبات India: A Polyglot

Nation and its Linguistic Problems Vis-a-Vis National integration کا میں نے اہتمام کیا تھا اور چٹرجی صاحب از راہ نوازش بمبئی تشریف لائے تھے۔ یہ خطبات کتابی صورت میں شائع بھی ہوئے تھے۔ گیان چند صاحب سے میری مستقل خط و کتابت تھی اور وہ چٹرجی صاحب کے ان خطبات سے واقف تھے۔ بین السطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ جین صاحب نے اس کتاب کی اطلاع امرت رائے کو بھی دی تھی۔ چنانچہ امرت رائے نے مجھ سے اس کتاب کا ایک نسخہ طلب کیا تھا، جس کی میں نے تعمیل کی تھی۔ اس کتاب (یعنی چٹرجی کی کتاب) میں اردو اور ہندی کے بارے میں ان کے پرانے نظریات میں انقلابی تبدیلی آئی تھی اور انہوں نے حیرت انگیز انکشافات کیے تھے۔ امرت رائے اور اب گیان چند جین نے ان اہم ترین خطبات کا اپنی کتابوں میں ذکر تک نہیں کیا۔ یہ غیر جانبدار اور غیر متعصب صالح مصنفین امرت رائے اور گیان چند کی غیر جانبداریت اور تحقیقی اخلاقیات کا طریق کار ہے۔

جین صاحب کی اس کتاب کی ''تمہید'' میں بہت ساری غلط بیانیاں اور خود ساختہ نتائج ہیں۔ اگر سب کے بارے میں گفتگو کی جائے تو '' لکھے گئے دفتر'' والا معاملہ ہوگا، لہٰذا میں ذیل میں چند اور منتخب باتوں پر اظہار خیال کروں گا:

گیان چند لکھتے ہیں:

> ''جانب داری سے بھی زیادہ افسوس ناک، علمی معاملوں کو مذہبی اور فرقہ ورانہ رنگ دینا ہے'' ...... یہ بات بالکل صحیح ہے، لیکن افسوس کے ساتھ یہ بھی لکھنا پڑتا ہے کہ جین صاحب لکھتے کچھ ہیں، کرتے کچھ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے خود بھی اپنی زیر نظر کتاب میں مذہبی اور فرقہ ورانہ تعصب کا رنگ بھرا ہے۔ جس کا اظہار ان کے مضامین اور کتابوں میں جابجا دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ بقول جین صاحب ''دوسروں کے بارے میں کچھ کہنے سے

احتراز کرنا چاہیے اور اہل قلم کی وفاداری کسی علاقے، مذہب، زبان یا رسم الخط سے نہ ہو کر محض سچ سے ہونی چاہیے۔"

علاقہ یہاں خارج از بحث ہے، لیکن مذہب چاہے اسلام ہو، ہندومت ہو یا کوئی اور، وہ سچ ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ لہٰذا کلیتہً مذہب سے کنارہ کش ہونا ممکن نہیں۔ زبان اور رسم الخط کو شاطرانہ انداز سے "وفاداری" اور "سچ" کے بہانے محض سیاسی طریق کار یا سیاسی فکر کے تئیں جوڑنا اور نشانہ بنانا بھی غلط ہے۔ یہاں خود جین صاحب مفتی اعظم سے کم نہیں ہیں۔

اردو والوں کے حوالے سے یہ کہنا کہ وہ غیر علمی علائق سے کچھ زیادہ ہی بہرہ یاب ہیں صحیح نہیں۔ لیکن بہر طور وہ اس طرح کے جھاڑو پھیرنے والے فقروں (Sweeping Remarks) میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ دوسروں کے خیالات اور بیانات کو ٹھنڈے دل سے پڑھنا چاہیے اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" کا اتباع کرنا چاہیے۔ خواہ مخواہ الجھنے سے معاملات پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ لسانی معاملات میں اس طرح کی پیچیدگیاں قدم قدم پر پیش آتی ہیں۔ گیان چند نے اس کے بعد زرین سات نکات پر بحث کی ہے:

ا۔ کھڑی بولی کے سلسلے میں جین صاحب کے فرمودات بھی، اختلافی ہیں۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ "کھڑی بولی ہندی (اندازاً ۱۰۰۰ء تا ۱۵۰۰ء) محض ایک واحد زبان نہیں بلکہ شمالی ہند کی مختلف زبانوں اور بولیوں کا ایک وفاق ہے" وغیرہ محل نظر ہے۔ سب سے پہلے تو "کھڑی بولی ہندی" کا فقرہ ہی غلط ہے۔ یہ تو صرف کھڑی بولی ہے، جس سے بہت بعد میں ہندی کا ارتقا ہوا۔ ۱۰۰۰ء تا ۱۵۰۰ء، کھڑی بولی ہندی تھی ہی نہیں یہ تو ایک زبان کا تشکیلی دور تھا۔ جین صاحب کا یہاں انداز علمی نہیں بلکہ سیاسی ہے، ورنہ علمی طور پر ہریانی، برج، اودھی، بھوجپوری وغیرہ ہندی کی وسیع تر برادری کی زبانیں نہیں بلکہ آزاد زبانیں اور آزاد ادب ہیں۔ ان زبانوں کے بولنے والوں سے کب کسی نے پوچھا کہ

ان کی رائے کیا ہے۔ کیا وہ آزادانہ شناخت چاہتے ہیں یا ہندی میں ضم ہونا چاہتے ہیں؟ یہ تو یکطرفہ فیصلہ ہے جو ہندی سامراجیت کی مثال ہے۔ اور ہاں اگر اس قسم کا سیاسی فیصلہ ہو بھی جائے تو بالادستی علمی فیصلہ ہی کی ہوگی۔ اس سلسلے میں علمی فیصلے ہو چکے ہیں۔ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر بابو رام سکسینہ نے جو اگرچہ بعد میں ہندی برادری کے فرد بنے، اپنی مشہور کتاب "اودھی کا ارتقا" Evolution of Awadhi۔ میں اودھی پر محاکمہ کیا ہے۔ اگر وہ اودھی کو ہندی مانتے ہوتے تو وہ Evlution of Hindi لکھتے، نہ کہ Evolution of Awadhi۔ بین السطور میں ڈاکٹر بابو رام سکسینہ کا مطمحِ نظر واضح ہو جاتا ہے۔

۲۔ جہاں تک اردو کے میل جول کی زبان کا تعلق ہے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ "دو یا زیادہ زبانوں کے میل جول سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہو سکتی۔" یہ کلیہ نہیں ہے، اس میں مستثنیات بھی ہیں۔ اردو انہیں مستثنیات میں سے ایک ہے۔ لسانیات کا علم Max Muller کے عہد سے بہت آگے پہنچ چکا ہے۔ انیسویں صدی کے مشہور ماہر لسانیات Weinreich نے جس نے ذولسانیات پر گرانقدر تحقیقی کام کیا ہے، اپنی معروف کتاب Languages in Contact میں لکھا ہے کہ جب دو زبانیں ایک دوسرے کے ربط میں آتی ہیں تو بعض اوقات اس لسانی ربط کے نتیجے کے طور پر تیسری زبان بھی عالم وجود میں آتی ہے۔ Weinreich کے الفاظ ہیں:

> 'New hybrid languages, such as the creoles and pidgins, have been formed as a result of the modifications in languages that have been in contact. Their status as new languages may be said to be due to the fact that they have attained some or all of the following: (1) a form palpably

different from either stock language: (2) a certain stability of form after initial fluctuations; (3) functions other than those of a workaday vernacular e.g. use in the family, in formalized communication; (4) a rating among the speakers themselves as a seprarate language. In some contact situations, no new languages, in the above sense, have developmed. (1)

وانرخ نے اپنی اسی کتاب میں، اس خیال کا پھر اعادہ کیا ہے کہ کچھ حالات میں ربط زبان ایک تیسری نئی زبان کو بھی جنم دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"Some situations of languaeg contact have been productive of new, third Languages, while others have not. (Page 104)"

اردو، ربط زبان سے پیدا ہونے والی تیسری زبان کی ایک واضح مثال ہے۔ گیان چند جین صاحب کی اس موضوع پر دستاویزی کتاب نظر سے نہیں گزری، ورنہ وہ اپنے فتوے سے احتراز کرتے۔

کیا Weinreich کو بھی جین صاحب لسانی گپ باز کہیں گے، یا اردو والوں کا جانب دار ہونے کا ملزم قرار دیں گے۔ جہاں تک اردو کی تعمیر کا سوال ہے، اگر انشا، حالی، سید احمد دہلوی اور عبدالحق وغیرہ نے یہ بات کہی ہے کہ اردو کی تعمیر میں غیر مسلموں کا کوئی ہاتھ نہیں ہے تو میں ذاتی طور پر اور اردو والے عمومی طور پر یہ بات ماننے کے لیے

(1) Uriel weinreich: Languages in contact, page 69, Second edition (1963) Mouton & co, The Hague

تیار نہیں ہیں۔ اردو ایک مشترکہ تہذیب کی علامت کے طور پر بنی جس کی بنیاد اپ بھرنش ہے اور اس کا بنیادی کینڈا ہندوستانی ہے۔ دو تہائی الفاظ ہندی الاصل ہیں اور اس کے بیشمار ادیب اور شاعر ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی بھی ہیں۔ یہاں بخوف طوالت ایسے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی فہرست دینا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ خود جین صاحب بھی ایسی کتابوں سے اور ایسے ادیبوں اور شاعروں سے واقف ہیں اور کالی داس رضا اور جناب مالک ٹالہ تو جین صاحب کے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں۔ رضا صاحب نے بحیثیت ماہر غالبیات اور محقق شہرت پائی اور مالک ٹالا صاحب پریم چند کے محقق کی حیثیت سے اردو زبان و ادب میں استناد کی حیثیت رکھتے ہیں اور پریم چند کو بنیادی طور پر اردو کا ادیب مانتے ہیں اور پھر خود گیان چند جین صاحب بھی اپنی تمام تر اردو دشمنی کے باوجود اردو تحقیق میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

امرت رائے کی حمد و ثنا کے بعد (ص ۱۵۔۱۶) تاریخ میں مسلمانوں کی زبان اور رسم الخط کی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جن علاقوں کو فتح کیا وہاں کی زبان اور رسم الخط کو ان پر مسلط کیا۔ انہوں نے امرت رائے کے حوالے سے بطور خاص ایران کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے (مسلمانوں نے) ہندوستان میں بھی اس پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کی۔" میرا معروضہ ہے کہ یہ بھی تقریباً مبالغہ ہے۔ کسی حد تک ممکن ہے ایسے ہوا ہو، مگر اس بات کو خارج از امکان نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمانوں (عربوں) نے اپنی سہولت کی خاطر قدیم اوستھائی رسم الخط کو سیکھنے کے بجائے فارسی کو عربی رسم الخط میں ضبط تحریر کیا ہو۔ یہی صورت حال ترکی میں بھی رہی ہو اور پھر رعایا نے فاتحین کے ساتھ عربی رسم الخط سیکھا ہو اور ضرورتاً اس کی اصلاح بھی کی ہو۔ جنوبی افریقہ کی زبان جسے "افریکانس" (Afrikans) کہا جاتا ہے، ابتدا میں یہ زبان عربی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی تھی، بعد میں جب ڈچ (Dutch) وہاں پہنچے تو انہوں نے اسے رومن (Roman) رسم الخط دیا۔ میں نے ۱۹۸۹ء میں کیپ ٹاؤن یونیورسٹی میں "افریکانس" کی ابتدائی

مطبوعات کو عربی رسم الخط میں دیکھا ہے۔

ہندوستان میں سندھی، کشمیری اور پنجابی نے یقیناً عربی۔ فارسی (Perso-Arabic Script) کو اپنایا۔ اردو، ہندی، ریختہ، ہندوستانی یعنی مترادفات اردو نے بھی اسی رسم الخط کو اپنایا۔ اودھی نے بھی اسی رسم الخط کو اپنایا، ملک محمد جائسی کی "پدماوت" اور دوسری کتابیں اسی طرح قطبن کی "مرگاوتی" ملا داؤد کی "چنداین" اور ملا عثمان کی "چتراولی" کا رسم الخط فارسی رسم الخط ہے۔ سوامی تلسی داس کی "رامائن" دیوناگری میں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہیے کہ زبانیں بنیادی طور پر تکلم کے لیے ہوتی ہیں۔ جب یہ ادبی اظہار کا ذریعہ بنتی ہیں اور ان کا ادبی ارتقا ہوتا ہے تو انھیں رسم الخط مل جاتا ہے۔ وہ لوگ جو ہندوستان میں تہذیبی اعتبار سے فارسی عربی کی روایت سے وابستہ تھے انھوں نے اپنے ادبی اظہار کے لیے فارسی، عربی رسم الخط اختیار کیا اور وہ لوگ جو سنسکرت روایت سے وابستہ تھے انھوں نے دیوناگری رسم الخط کو اپنایا اور اس طرح ابتدا میں ایک ہی زبان دو لکھاوٹوں میں لکھی گئی۔ بنگالی بھی بنگالی اور فارسی عربی رسم الخط میں لکھی گئی، تامل اور ملیالم کی بھی یہی صورت حال رہی ہے۔ عرب تامل اور عرب ملیالم جس پر عربی اور فارسی کے اثرات زیادہ ہیں، اسی صورت حال سے دوچار رہی ہے۔ مغربی ہندوستان میں بمبئی تا گوا اور شمالی کرناٹک میں بولی جانے والی "کوکنی" کو مسلمانوں نے عربی (نسخ) میں لکھا، گوا کے عیسائیوں نے رومن میں، ہندوؤں نے دیوناگری میں اور شمالی کرناٹک (کینارا) میں اسے کنڑ رسم الخط میں لکھا گیا۔

دیوناگری رسم الخط کے بارے میں جین صاحب سے میں پوری طرح متفق ہوں کہ ہندوستانی بھاشاؤں اور لپیوں میں زوردار پھیلاؤ ہے اور اس کی وجہ سے ساری ہندوستانی زبان کا رسم الخط نہیں بدلا جا سکا۔ لیکن میں یہ بھی مانتا ہوں کہ اس طرح کی کوئی ارادی کوشش کی بھی نہیں گئی۔ حکمرانوں کا رویہ زبانوں کے بارے میں معاندانہ نہیں تھا، وہ اس ملک کی تہذیبی زندگی میں اپنے آپ کو پیوست رکھنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ بیرونی

(Foreigners) ضرور تھے، مگر انہوں نے ہندوستان آ کر حکومت بھی کی اور اس ملک کو اپنایا اور اس سے محبت بھی کی۔ رسم الخط کے تعلق سے اگر انہوں نے کوشش کی ہوتی تو ہندوستان کی ڈھیر ساری باثروت زبانیں زندہ نہیں رہ پاتیں۔ کم از کم ادھ موئی ضرور ہو جاتیں۔ جین صاحب نے صفحہ ۱۶ پر مقامی شبد بھنڈار کا ذکر کیا ہے اور الزام مسلمانوں کے سر ہے کہ "انہوں نے عربی فارسی لفظیات اور رسم الخط میں خلعتِ قبول دیا" ...... یہ بھی ایک متعصبانہ رویہ ہے جس کا جین صاحب کے طرزِ تحریر ہی سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی گفتگو علمی انداز کی نہیں ہے بلکہ حملہ آورانہ (Offensive) ہے، جیسے انہوں نے اردو کے خلاف کوئی جنگ چھیڑ رکھی ہو۔ یہاں پر میں ایک بات عرض کروں۔ مراٹھی بھی اردو اور ہندی کی طرح ایک ہند آریائی زبان ہے۔ اس کا شبد بھنڈار سنسکرت کا ہے، مگر اس میں لاتعداد الفاظ فارسی اور عربی کے دخیل ہیں اور مراٹھی والوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ کوئی دخیل الفاظ ہیں، فارسی عربی سے آئے ہیں، بس یہ مراٹھی کا جز ہیں اور جز رہیں گے۔ ہاں گنگا دھر تلک کے زمانے میں مراٹھی سے فارسی عربی الفاظ کو خارج کرنے کی اور ان کی جگہ سنسکرت الفاظ لانے کی کوشش کی گئی، مگر فوراً غلطی کا احساس ہو گیا، کہ اس سے زبان کمزور ہو رہی ہے اور اس کی قوت اظہار پر اثر ہو رہا ہے۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ مراٹھی کے کلاسیکی ادب میں "بکھر ادب" کی بڑی اہمیت ہے، بکھر، عربی لفظ خبر کی تقلیب ہے۔ یہ واقعہ نگاری ہے جو مراٹھا ہندوؤں کی دین ہے، اس "بکھر ادب" پر فارسی چھائی ہوئی ہے۔ اردو فارسی کی طرح مقفیٰ اور مسجع عبارتیں ہیں، شعری پیرایہ ہے، فارسی قواعد کا اس پر اثر ہے، لیکن یہ مراٹھی ہے۔ فارسی یا اردو نہیں ہے۔ تاریخ میں ایسے مقامات آتے ہیں اور زبان و ادب میں بلا ارادہ خاموش تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جین صاحب! تاریخ سے اور لسانی و تہذیبی تبدیلیوں سے نبرد آزما ہونے کا اور الزام تراشیوں کا راستہ غلط ہے، اسے قبول کرنا چاہیے۔ تاریخ تاریخ ہے، اس سے شرمانے کی ضرورت بے جا ہے، اسی سے دکھ اور کرب کا شجر پیدا ہوتا ہے۔

جین صاحب کی اس گھنگھور سیاہ بادلوں والی کتاب میں نہ جانے ایک روشنی کی کرن کہاں سے آ گئی؟ ایک سچ تو کہہ ہی دیا۔ جین صاحب لکھتے ہیں:

"اس کے باوجود مجھے یہ ماننے میں کوئی تامل نہیں کہ کھڑی بولی ہندی، نسبتاً ایک پچھڑی ہوئی جامد زبان تھی۔ بیرونی مسلمانوں کی سرپرستی اور نوک پلک سنوارنے کے بعد یہ اردو کے پیراہن دلکش کی شکل میں، ادبی محاورے میں چہچہاتی ہوئی ظاہر ہوئی۔ ثقافت کو تر وتازہ رہنے کے لیے بیرونی لین دین سے کوئی پرہیز نہیں ہوتا۔ اسلامی دور میں ہندوستان نے فنون لطیفہ اور تہذیب میں بہت کچھ اضافے کیے۔ حد تو یہ ہے کہ بیرونی بنی رہنے والی انگریزی حکومت کی وجہ سے مغربی اور نئی تہذیب سے صاحب سلامت ہوئی۔ جمہوریت کا تصور، قانون کی حکومت، نظام عدالت، بین الاقوامی کشادہ نظری، ذرائع نقل و حمل، وائسرائے ہاؤس (راشٹر پتی بھون)، کونسل ہاؤس، پہاڑوں پر آبادیاں وغیرہ اہم اضافے ہیں۔" جین صاحب نے مذکورہ کتنی پیاری بات کہی، صرف ایک اضافہ کروں گا کہ جو دین انگریزوں کی ہے، اس میں تھوڑا سا حصہ مسلمانوں کا بھی ہے، جیسے شیر شاہ سوری کی گرینڈ ٹرنک روڈ (Grand Trunk Road) جس کا اس عہد میں تصور کرنا بھی مشکل تھا، اور کشمیر کی سیرگاہیں جیسے نشاط باغ اور شالیمار باغ اور اجنتا اور ایلورا کی نگہداشت، جو نظام نے کی...... یہاں رشید احمد صدیقی کا مشہور قول دہرانے کو جی چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ:

"مغلوں نے ہندوستان کو تین چیزیں عطا کی ہیں تاج محل، اردو اور غالب"۔ یہ جملہ اپنے اندر کئی دفتر پوشیدہ رکھتا ہے۔

گیان چند جین آگے چل کر شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ (یعنی فاروقی) اور ان کے ہمنوا الزام لگاتے ہیں۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ اور فورٹ ولیم کالج نے مذہبی بنیادوں پر اردو کے مقابلے میں، ہندی کی تشکیل کی۔ مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں"...... جین صاحب کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ نابالغہ روزگار، بین الاقوامی شہرت

کے عالم اور ماہر لسانیات، تاریخ داں اور علم البشریات کے عالم سنیتی کمار چٹرجی بھی اسی خیال کے قائل ہیں کہ اردو کے مقابلے میں ہندی کی تشکیل کی گئی۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب "ہند آریائی اور ہندی (Indo Aryan & Hindi) میں لکھا ہے کہ " آریہ ورت کی ایک بڑی زبان کی حیثیت سے ہندی کو بنگال میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہندوستان کی دوسری جانب مہارشی دیانند سرسوتی، جو اصل میں گجرات سے تعلق رکھتے تھے، کلکتہ کے قیام کے دوران انہوں نے پنجاب میں آریہ سماج کی بنیاد رکھی، اس مطمح نظر کے ساتھ کہ ہندو سماج کی اصلاح ہو اور ویدک مذہب کی ان کے خیالات کی روشنی میں تجدید ہو (اور اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے سنسکرت آمیز ناگری ہندی کی وکالت کی تاکہ ہندوؤں میں رائج فارسی اور اردو کو جن پر اسلامی رنگ ہے قوسیا یا جاسکے" ...... بقول پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی "دیانند سرسوتی سے کچھ پہلے ماہر تعلیم اور "برہمو سماج" کے مبلغ نوین چندر رائے Navin Chandra Roy نے بھی سنسکرت آمیز ہندی کی وکالت کی تھی جو مناسب طور پر پنجاب اور یوپی میں ترقی کر رہی تھی"۔ (دیکھئے Indo- Aryan and Hindi by S.K. Chatterji 2nd Ed. Page 158)۔ ہر وہ شخص جو ہندوستانی زبانوں کے ادب سے، تاریخ اور علم الانسان سے دلچسپی رکھتا ہے، سنیتی کمار چٹرجی کی دیوپیکر شخصیت سے واقف ہے، لیکن میں یہ بتاتا چلوں کہ میرے محسن و کرم فرما پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی، ممتاز فلسفی اور ماہر تعلیم صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کے ہم جماعت تھے اور انہوں نے چٹرجی کے بارے میں کہا تھا کہ "یاسکا اور پانینی کے بعد ہندوستان میں دو ہزار سال کی تاریخ میں اتنا بڑا عالم پیدا ہوا ہے"۔ کیا گیان چند سنیتی کمار چٹرجی کو بھی رد کریں گے؟ جین صاحب اس موقع پر اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ "برج بھاشا اور کھڑی بولی ہندی میں الگ الگ کئی صدیوں سے نثری کتابیں ملتی ہیں" شاید ملتی ہوں گی، مگر یہ اعتراف بہت اہم ہے کہ وہ ان دونوں زبانوں کو الگ الگ زبانیں مانتے ہیں، ورنہ اہل ہندی قدامت کی تلاش میں برج

بھاشا کو بھی جو آزاد زبان ہے اور آزاد ادب کی حامل ہے "ہندی" کہنے سے نہیں جھجکتے۔ جین صاحب کی باقی گفتگو قیاس آرائیوں سے آگے نہیں بڑھتی۔

جین صاحب ۱۹۰۰ء میں میکڈانل کے حکم نامہ تک بہار کو چھوڑ کر "شمالی ہند میں یعنی بنگال، بنارس، آگرہ، اودھ اور پنجاب میں اردو فارسی کو سرکاری اور عدالتی زبان" ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں ان کی فکر واضح نہیں ہے، تاہم یہ حقیقت تھی کہ اس دور میں اردو ہی مقبول عام زبان تھی اور ہندی کو لسانی منظر نامہ پر لانا ہی فتنہ و فساد کا باعث ہوا۔ نہ صرف مسلمان بلکہ کائستھ بھی جو اردو کے مربی تھے دیوناگری کی اجازت کے باوجود اردو رسم الخط ہی استعمال کرتے تھے۔

سرسید کے حوالے سے جین صاحب کی گفتگو انتہائی غیر شائستہ ہے جو افسوسناک بھی ہے اور حقیقت سے بعید بھی ہے۔ چونکہ اردو ایک عام لنگوا فرینکا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک سرمایہ تھی، اس کے خلاف سیاسی سازش فرقہ واریت کا زہر گھولنے کا نتیجہ تھی، سرسید کا ہندوؤں سے مطالبہ غلط نہیں تھا۔ اورنگ زیبی دور ختم ہو کر ۱۹۰۰ء میں دو صدیاں گزر چکی تھیں اور اورنگ زیب کی جو تصویر انہوں نے اپنے دل پر نقش کی ہے وہ اورنگ زیب کی نہیں کسی اور کی ہوگی۔ اورنگ زیب کی صحیح تصویر کے لیے بشمبر ناتھ پانڈے (۱) اور پروفیسر پرساد (۲) کی کتابوں سے رجوع ہونا چاہیے تاکہ حقیقت حال سے واقفیت ہو سکے۔

---

(۱) B.N. Pande: Islam and Indian culture. Khuda Baksh Oriental Public Library, Patna.

(۲) Prasad: Aurangzeb

دیکھئے: صباح الدین عبدالرحمٰن: ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری (جلد سوم) سلسلہ دارالمصنفین، اعظم

جہاں تک زبانیں بنانے کا سوال ہے زبانیں نہ مسلمان بناتے ہیں نہ ہندو بناتے ہیں۔ ان کا ارتقا حالات کے تابع ہوتا ہے۔ البتہ سیاسی پس منظر اور فرقہ ورانہ ذہن زبانوں کے مزاج کو متاثر ضرور کرتے ہیں، جدید ہندی اس کی مثال ہے۔ گزشتہ صفحات میں چٹرجی کے حوالے سے اس پر گفتگو ہو چکی ہے لہٰذا اس کی تکرار غیر ضروری ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد نوین چندر رائے کا مصنوعی عمل حکومت ہند کے سرکاری دفتروں میں حاوی رہا، جس کے نتیجہ میں جدید ہندی مشکل سے مشکل تر ہوتی گئی اور اس کا عوام سے رشتہ ٹوٹ گیا اور سیاست کے ہاتھوں مات کھانے کے باوجود اردو آج بھی رابطہ کی اور عام ابلاغ و ترسیل کا وسیلہ ہے۔ جہاں تک فرمان فتح پوری، معین الدین عقیل اور جمیل الدین عالی کے اردو، مسلم لیگ اور پاکستان کے حوالے سے آرا کا تعلق ہے، ان سے اتفاق کرنا ممکن نہیں۔ ان خیالات کو موجودہ پاکستانی سیاسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے جو اہل پاکستان کی سیاسی مجبوری ہے۔ (جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' میں اردو کی تشکیل و ارتقا کے بارے میں پاکستان کے حوالے سے جو نظریہ قائم کیا گیا ہے، وہ بھی گمراہ کن اور غیر علمی ہے جس کا پس منظر اہل پاکستان کی (ان کی بھی جو یہاں سے ہجرت کر کے گئے تھے) سیاسی مجبوری ہے۔ ان حضرات کا یہ کہنا کہ ''اردو تحریک کا بنیادی مقصد پاکستان بنوانا تھا'' انتہا درجہ کا کذب ہے۔ اس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ گیان چند جین صاحب سے اس سلسلے میں اتفاق کرنا ناممکن ہے۔ لسانی جنون کا شکار جس طرح اردو والے ہوئے ہیں اس سے کہیں زیادہ یہ لسانی جنون اہل ہندی کے یہاں ہے۔ آزادی ہند کے بعد ہندی کے نام پر کئی فسادات ہو چکے ہیں۔ مجھے ایسے کئی واقعات معلوم ہیں کہ ہندی کے قابل ہونے کے باوجود ہندی کا لیکچرر یا صدر شعبہ بننا صرف اس لیے نصیب نہیں ہوا کہ اپنی ہندی کی لیاقت کے باوجود ان کا تعلق غیر ہندی علاقوں سے تھا، بہانے یہ بنائے گئے کہ انھیں ہندی کی اسامی کے لیے ایسے لوگ چاہئیں، جن کی ماتر بھاشا (مادری زبان) ہندی ہو۔ جیسے

لوگوں سے میں واقف ہوں ان میں سے دو جنوبی ہند کے اور ایک گجرات کے تھے۔ تین میں سے دو نے Politics میں ایم۔ اے کیا اور وہ سیاسیات میں لیکچرر ہوئے اور ایک نے لسانیات میں تخصص حاصل کیا اور IIT کانپور میں لسانیات کے استاد مقرر ہوئے اور Computational Linguistics میں نام پیدا کیا۔ ''اہل زبان'' اردو والوں میں بھی یہ تعصب ہے اور وہ غیر اہل زبان اردو والوں کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور خود احساس برتری کا شکار رہتے ہیں۔ یہ غالباً ''ہندوستانی کے علاقہ'' (اردو ہندی بیلٹ) یا Cow belt کا مزاج ہے۔ اس کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی کا جب قیام عمل میں آنے جا رہا تھا (۸۲-۱۹۸۱ء) تو ''قومی آواز'' ممبئی میں شعبہ اردو کے تعلق سے ایک تحریک چلائی گئی تھی کہ شعبہ میں تقرر کسی مقامی اردو بولنے والے شخص کا نہیں بلکہ کسی ''اہل زبان'' کا ہو۔ مقامی حضرات کے حوالے سے جو مضامین شائع ہوئے وہ ممبئی کے کالجوں کے اساتذہ اور صحافیوں کے تھے۔ دلی سے بھی اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی، مگر علی سردار جعفری، حسن نعیم اور دیگر ادیبوں اور عالموں نے اس رویہ کے خلاف آواز اٹھائی۔

بہرحال یہ تھیسس کہ ''اردو تحریک کا بنیادی مقصد پاکستان بنوانا تھا'' (ص ۱۹) چاہے کسی کے ذہن کی اپج ہو لغو بات ہے۔ پاکستان تحریک سے متعلق گفتگو میرا موضوع نہیں ہے۔ اس پر تاریخ اور سیاسی بصیرت کے حامل سکالروں نے لکھا ہے جن میں سروائی (Sirwai) کی کتاب Partition & Reality اور عائشہ جلال کی کتابیں شہرت رکھتی ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم ہندوستانی تاریخ کا ایک المناک واقعہ ہے۔ اس کی ذمہ داری غیر رواداری کا جذبہ ہے، جس کے ذمہ دار ہندو اور مسلمان دونوں ہیں۔ تقسیم ہند کی ذمہ داری دونوں ہی کو قبول کرنی چاہیے۔

گیان چند صاحب نے اپنے سات (۷) نکاتی پروگرام (ص ۱۵ تا ۱۸) میں جامعہ عثمانیہ کو بھی شامل رکھا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام (۱۹۱۷ء) میں قلم رو نظام میں ہوا جو

ایک آزاد ریاست تھی۔ اردو کے فروغ میں جامعہ عثمانیہ کا حصہ ہندوستانی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے ایک مثالی تجربہ تھا، جو بے انتہا کامیاب رہا۔ یہاں سائنس اور سماجی علوم کی تعلیم اردو میں ہوئی۔ ڈاکٹر اور انجینئر اردو ذریعہ تعلیم سے پیدا ہوئے جنہوں نے ملک گیر نہیں بلکہ عالمگیر شہرت پائی۔ ہمارے سابق وزیر داخلہ اور مہاراشٹرا کے سابق وزیر اعلیٰ پنجاب ایس۔ بی چوان نے اردو میں قانون کی ڈگری حاصل کی بمبئی کے مشہور جسلوک ہسپتال کے نیوکلیئر میڈیسن (Nuclear Medicine) کے ڈائریکٹر عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ التحصیل ڈاکٹر لے لے ہیں۔ جب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہوا اور راقم نے ان سے ملاقات کی تو انہوں نے اردو کو اعلیٰ تعلیم کا کامیاب تجربہ بتاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کا بیان Times of India میں بھی شائع ہوا تھا۔ جین صاحب اس تجربہ پر طنزیہ مبارکباد دیتے ہیں (کلاہ فخر مبارک ہو)، انہیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے اس تجربے نے ساری ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔ اس تجربہ سے دوسری زبانیں بھی فیض اٹھا سکتی تھیں (ہیں)۔ اردو ایک اعلیٰ تعلیم کے لیے آزمودہ زبان تھی، اگر اسے لسانی، مذہبی اور تہذیبی تعصب کھا نہ گیا ہوتا تو ہندوستان کی لنگوا فرانکا ہونے کے ناطے انگریزی کی جگہ اردو ہی نے لی ہوتی ...... عثمانیہ یونیورسٹی کے معیار کی شہرت ملک اور بیرونی ممالک میں بھی تھی، آج یعنی ۱۹۴۸ء کے بعد تعصب، تنگ دلی اور تنگ نظری تر نوالہ کی طرح اسے کھا گئی۔ ہندوستانی تعلیمی زندگی کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے...... اس تعلق سے جین صاحب نے دوسرے کئی سوال اٹھائے ہیں، جن کا جواب دینا وقت ضائع کرنا ہوگا۔ یہ ساری گفتگو جین صاحب کے مسلمانوں اور اردو سے شدید تعصب اور انتشار ذہنی کا نتیجہ ہے۔

گیان چند جین نے امریکہ اور کینیڈا کے حوالے سے بھی چند باتیں کی ہیں، جو یک طرفہ ہیں۔ اگر امریکہ اور کینیڈا میں اردو کے حوالے سے کوئی تقریب ہوگی (جہاں

اردو والوں کی اکثریت پاکستانیوں پر مبنی ہے)، تو ظاہر ہے اس تقریب کی نوعیت اسی نوعیت کی ہوگی جس کا ذکر جین صاحب نے کیا ہے۔ یہ تو Common Sense کی بات ہے۔ اس طرح کے واقعات کو مسئلہ بنانا ذہنی فتور سے زیادہ نہیں۔ مجھے لندن میں اردو اور ہندی والوں کے منعقدہ ادبی جلسوں میں شامل ہونے کا موقع ملا ہے۔ اردو کے جلسوں میں پاکستانی اور ہندوستانی اور ہندوستانیوں میں کئی ہندو اپنے افراد خاندان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں ایک نیم ادبی اور نیم سیاسی نوعیت کے جلسے میں جو ۱۵ اگست کے موقع پر منعقد کیا گیا تھا، میں بھی مدعو تھا۔ مدن موہن کالیہ جو بمبئی کے ایک سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور انجمن ترقی اردو، بمبئی کے سیکرٹری رہ چکے تھے، میرے ملاقاتی تھے۔ میں انہیں کی دعوت پر اس جلسہ میں شریک تھا۔ اس جلسے میں میری بڑی عزت افزائی ہوئی، لیکن یہ جلسہ اہل ہند کی نہیں بلکہ اہل ہندی کی تقریب تھی۔ پاکستانیوں کی وفاداری پاکستان سے نہیں تو کیا ہندوستان سے ہوگی۔ یہی حال ہندوستانیوں کا بھی ہوگا، یعنی ان کی وفاداری ہندوستان سے ہوگی جو ان کا ملک ہے مذکورہ جلسہ کے بارے میں کسی نے مجھے بتایا کہ منتظمین مسلمان دشمن اور B.J.P کے لوگ ہیں، ہوں گے لیکن میں نے اس جلسہ میں شرکت کی کہ وہ میرے عزیز وطن ہندوستان کی آزادی کا جشن تھا۔ جین صاحب! مسعود حسین خان میرے بزرگ اور آپ کے دوست ہیں جن کے نام آپ نے اپنی کتاب بھی معنون کی ہے اور کیچڑ بھی اچھالا ہے، ان کا ایک شعر ہے

میرے وطن، میرے ہندوستاں، عزیز وطن
تجھے بہشت کہا، ہم نے اپنا گھر نہ کہا

کالی داس رضا کے حوالے سے جو باتیں جین صاحب نے لکھی ہیں ان میں شرارت کا عنصر ہے۔ پہلے میں یہ بتادوں کہ کالی داس رضا کے یہاں دولت وثروت نے بے انتہا رعونت پیدا کی تھی۔ انہیں اچھی اردو لکھنے پر قدرت حاصل تھی۔ سیدھی سادھی

سپاٹ بے مزہ شاعری بھی کرتے تھے۔ عروض سے انہیں خصوصی دلچسپی ہی نہیں اس پر عبور حاصل تھا۔ ابتدا میں جب وہ کینیا کے شہر نیروبی میں تھے، ہندوستان کے عام طور پر معمولی رسائل میں معمولی نوعیت کے مضامین شائع کرتے تھے۔ جن میں ایک بمبئی کا معمولی رسالہ بھی تھا۔ بعد میں جب وہ مستقلاً بمبئی منتقل ہوئے تو انہوں نے اپنی لائبریری بنائی۔ جمیل الدین صاحب جو اصل میں ٹونک کے رہنے والے تھے ان کے پاس نایاب کتب کا ذخیرہ تھا، بشمول "نوادرات غالب"...... غالب پر ایک بڑا ذخیرہ تھا جسے غالب صدی کے موقع پر وہ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ میں "مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری میں ڈائریکٹر" تھا۔ جمیل الدین صاحب کے اپنے نوادرات کی فہرست میرے پاس بھی آئی۔ جمیل صاحب اس ذخیرے کے پینتالیس ہزار ۴۵۰۰۰ تا ۵۰۰۰۰ پچاس ہزار روپے چاہتے تھے (ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے ان سے کہا تھا کہ اس ذخیرہ کی مالیت اتنی ہوگی کہ آپ بمبئی میں ایک اچھا فلیٹ خرید سکیں) میں نے اپنی کمیٹی سے مشورہ کیا جو مشہور و معروف عالموں جیسے پروفیسر ڈی۔ این۔ مارشل (Prof-D.N. Marshall) ڈاکٹر پی۔ ایم۔ جوشی (Dr. P.M. Joshi)، ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ کترے (Dr. S.M. Katre) ڈاکٹر ایس۔ این گجندر گڈکر (Dr. S.N. Gajendragadkar) اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی پر مشتمل تھی۔ اس نایاب ذخیرے کو پسند کیا گیا اور اس کی قیمت پندرہ تا بیس ہزار روپے تجویز کی گئی، جو جمیل صاحب نے قبول نہیں کی۔ غالب اکیڈمی، دلی کے مرحوم حکیم عبدالحمید صاحب بھی اس ذخیرہ کی اتنی ہی رقم پیش کرنا چاہتے تھے، ظاہر ہے وہ بھی قبول نہیں کی گئی۔ کالی داس رضا گپتا نے جو صاحب دولت و ثروت تھے، تاجر بھی تھے اور تحقیق سے بھی دلچسپی لے رہے تھے، مولانا عبدالرحیم (رائٹرس امپوریم بمبئی کے مالک اور عالم و مستشرق) کی مدد سے کچھ زیادہ پیسے دے کر یہ ذخیرہ حاصل کیا اور چند باذوق و باصلاحیت نوجوان کو جو روزگار کے طلب گار تھے، ملازم رکھا تاکہ اس ذخیرے سے مواد جمع کریں۔ کالی داس رضا کی تحقیق کا یہ پس منظر ہے۔

رضا صاحب کی یہ کتابیں جمیل الدین صاحب کے انتقال کے بعد شائع ہوئیں۔

رضا صاحب کا اردو تحقیق اور خصوصاً غالبیات میں ستارہ خوب چمکا، وہ ہر محفل کی زینت بنتے رہے۔ انعام واکرام پاتے رہے۔ اردو والوں نے انہیں خوب نوازا، پونے، شولا پور وغیرہ میں ان کے اپنے گروپ تھے، کہیں مشاعروں اور اصلاح سخن کے نام پر کہیں معاونین تحقیق کے نام پر۔ ان سے وابستہ نوجوان معاونین کتابوں سے مواد نکال کر ترتیب وتہذیب کا کام کرتے تھے۔ مالک رام بھی ہندو اور پنجابی تھے۔ اردو زبان و ادب میں ان کی خدمات کو احترام اور عزت کی نظر سے دیکھا گیا۔ ان کو اردو کے ادبی اور علمی حلقوں میں باوقار مرتبہ حاصل رہا۔ اردو تحقیق اور غالبیات میں وہ مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلامیات پر بھی ان کی گہری نظر تھی، یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ان کے کام کو احترام وعزت سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ تعلیمی پیشے سے تعلق نہ ہونے کے باوجود بقول جین صاحب ان میں کوئی Handicap نہیں تھا۔ اردو زبان وادب کے لیے وہ سرمایہ افتخار تھے اور رہیں گے۔ اپنے علم وفضل کے باوجود ان میں رعونت نہیں تھی۔ غیر معمولی مہذب انسان تھے۔ کرشن چندر بھی ہندو اور پنجابی تھے اور ان کا بھی تعلیمی پیشے سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن اردو والوں کے وہ کرشن جی تھے۔ یہاں جین صاحب کا تعصب اور چشم حسود انہیں اعلیٰ منزلوں تک لے جاتا ہے۔

جہاں تک لسانی تنگ نظری کا تعلق ہے، یہ اردو والوں میں کسی حد تک ابتدا ہی سے موجود ہے۔ حاتم نے دکنی شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ:

اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

لیکن گیان چند جین صاحب کو یاد ہوگا کہ ایک دکن زادے کو میر نے اپنا معشوق کہا تھا:

معشوق جو ہے اپنا باشندہ دکن کا تھا

میر کے تعلق سے وہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ میر نے دوران سفر اپنے ہم سفر سے

گفتگو کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس سے ان کی زبان خراب ہو گی۔

دلی اور لکھنؤ والے خصوصاً ''اہل زبان'' ہونے کا لغو اور غیر لسانی رویہ رکھتے ہیں۔ عالم اور عامی سبھی اس رویہ کا شکار ہیں اور لکھنؤ اور دلی کی اردو ہی کو اعلیٰ مقام عطا کرتے ہیں۔ غیر اردو علاقے کے اردو والوں کو وہ لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ ایک زبان جب کثیر لسانی ماحول میں ترقی کرتی ہے تو اس میں مقامی لہجے اور مقامی لفظیات کے زیر اثر لسانی خصوصیات خود بخود پیدا ہوتی ہیں، اس فرق کو رواداری اور احترام کے جذبے سے قبول کرنا ضروری ہے۔ کالی داس گپتا اور دیگر پنجابی اردو کے اہل قلم کس شمار میں ہیں، اقبال جیسے عبقری پنجابی کو بھی اہل لکھنؤ نے اپنی لسانی تنگ نظری اور کم فہمی کا نشانہ بنایا۔ مولانا حسرت موہانی ان کی (اقبال کی) زبان پر معترض ہوئے، لیکن اقبالؔ کا اقبال ہمیشہ بلند رہا۔ اقبالؔ کی سی اقبال مندی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ قصہ صرف اردو والوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ پونے کے مراٹھی داں اپنے آپ کو اعلیٰ اور برتر سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں ناگپور یا دوسرے علاقوں کی مراٹھی معیاری نہیں، یہی حال گجرات میں گجراتی اور آندھرا میں تلگو کا بھی ہے ممکن ہے یہی صورت حال دوسری زبانوں کے ساتھ بھی ہو۔ برٹش انگلش اور امریکی و آسٹریلیائی و ہندوستان کی انگلش میں بھی اس طرح کے لسانی تعصبات رہے ہیں۔ جین صاحب کو شاید اردو والوں کے خلاف شدید تعصب نے ان باتوں پر غور کرنے کا موقع نہیں دیا۔

گیان چند جین نے یونیورسٹی میں تقررات کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''چھوٹی اسامیوں کے لیے ہندوؤں کی بہت تعریف اور آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ لیکن بڑے مقامات کے لیے امیدوار کا مذہب بھی دیکھا جاتا ہے''۔ اس ذہنیت پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ گیان چند جین، گوپی چند نارنگ اور حکم چند نیر لیکچرر کے بعد ہی تو پروفیسر بنے۔ ان کا جو بھی مذہب ہو لیکچرر تا پروفیسر شپ ایک ہی رہا ہے اور جگن ناتھ آزاد نے تو انفارمیشن آفیسر سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی پروفیسری کا منصب سنبھالا۔ مذہباً وہ

جو کچھ بھی رہے ہوں سبھی اس سے واقف ہیں اور مذکورہ بالا سبھی پروفیسروں کی عزت اور احترام کرتے ہیں اور اردو برادری میں کسی کو کسی کے مذہب یاد نہیں آتے، سبھی کا مذہب "اردو" ہوتا ہے، اس پر مزید تبصرہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ بقول حسرت

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اردو کے معیار اور استناد کا جہاں تک تعلق ہے، اس مسئلہ پر اس سے قبل گفتگو ہو چکی ہے۔ جہاں تک رفیقوں اور شاگردوں کے گروپ سے سہولت حاصل کرنے کا سوال ہے، میرا تجربہ ہے کہ یہ سہولت، ہر جگہ اور ہر یونیورسٹی میں حاصل نہیں ہوتی۔ جین صاحب خوش قسمت ہیں کہ انہیں یہ سہولت حاصل رہی۔ یہاں تک کہ زیر نظر کتاب کے ناقابل قرأت مسودہ کو بھی صاف تحریر میں لکھوانے کی بھی انہیں سہولت حاصل رہی۔ ان کے حیدرآباد یونیورسٹی سے وابستہ دو شاگردوں نے بتایا کہ کتاب کے ایک حصہ کو صاف کرنے کا کام طوعاً و کرہاً انہیں کرنا پڑا۔

پاکستان کے نصاب کے بارے میں گیان چند جین نے ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور محبوب صدر کے مضمون "تاریخ کے......" کے حوالے سے جو باتیں لکھی ہیں، وہ انتہائی تکلیف دہ ہیں۔ روشن چراغ پر اگر آپ ہاتھ رکھیں تو آپ کا ہاتھ یقیناً جل جائے، چراغ پر ہاتھ رکھنے کی بجائے اس کی روشنی کو پھیلنے دینا چاہیے۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ سیاسی، تہذیبی، علمی ہر لحاظ سے عالمی تہذیب کا روشن ترین باب ہے اور عالمی تہذیب کو ہندوستان کی دین سے سبھی واقف ہیں۔ گیان چند جین کو مذکورہ پاکستانی سکالروں اور نصاب گروں اور مورخوں کے غیر علمی رویہ سے جو تکلیف ہوئی اس میں وہ حق بجانب ہیں۔ یہ بات میرے لیے ذاتی طور پر اور ہندوستان کے ننانوے فیصد اردو والوں کے لیے بھی تکلیف دہ اور افسوس ناک ہے۔ اس مسئلہ پر زیادہ گفتگو کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے قارئین کو بشمول پاکستانی قارئین مشہور مورخ پروفیسر کے۔ ایل،

باشم (K.L. Basham) کی کتاب The Wonder that was India پڑھنے کا مشورہ دیں جس کا اردو ترجمہ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دلی نے "ہندوستان کا شاندار ماضی" کے نام سے شائع کیا ہے۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ ۱۹۶۲ء میں جب میں سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں لسانیات کا طالب علم تھا، پروفیسر باشم صاحب سے، جو وہاں تاریخ کے پروفیسر تھے ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ میری ہر اردو والے سے گزارش رہے گی کہ وہ اس کتاب کو ایک بار نہیں بلکہ بار بار پڑھیں اور ہندوستانی تہذیب کے ماضی، اس کی شاندار روایات سے آگہی حاصل کریں۔

لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ جین صاحب بھی B.J.P یا NDA کے فلسفہ وفکر کے طرز کی یہ کتاب نہ لکھتے تو اپنے آپ پر احسان کرتے۔ NDA حکومت نے بھی ہندوستانی تاریخ کو مسخ کرنے کا پروگرام مرتب کیا تھا۔ یہ واقعہ حال کا ہے اور سبھی لوگ اس پروگرام اور تاریخی کھلواڑ سے واقف ہیں۔ اس کا اثر ہندوستان میں گزشتہ پارلیمانی الیکشن پر بھی پڑا۔ افسوس کہ پاکستان میں آمریت ہے، ورنہ پاکستانی عوام بھی اس مسموم ذہنیت کے تعلق سے جمہوری نظام کے تحت اپنا مثبت فیصلہ سناتے۔ جہاں تک امریکہ اور کینیڈا کے اردو اخبارات اور انگریزی روزناموں کا سوال ہے، ان کا جھکاؤ یقیناً پاکستان کی جانب ہوگا۔ یوں بھی ہمارے دونوں ملکوں میں صحافت کے بنیادی کردار اور اس کی اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور پیدا نہیں ہوا ہے اور دونوں کا نقطۂ نظر تنگ اور جانبدارانہ ہے۔ کبھی کبھار ہمارے صحافیوں میں روشنی کی کرن ضرور نظر آتی ہے۔ جہاں تک ہندوستان اور ہندوؤں کو گالی دینے کا یا کسی اور کو گالی دینے کا سوال ہے، اس پر کف افسوس ملنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔ لیکن جین صاحب کا بیان کہ "اسے دیکھ کر ایک دفعہ تو دل میں یہ خیال آتا ہے کہ جب ہر ملک کے اہل اردو اتنی شدت سے پاکستان نواز ہیں تو ممکن ہے ہندوستان کے مسلمان بھی ان کے ہم خیال ہوں، لیکن ہندوستان میں ہندو اکثریت کے خوف سے شاید مصلحت سے کام لیتے ہوں"

......گیان چند جین کے دل میں مسلمانوں کے خلاف اس قدر زہر بھرا ہوا ہے کہ ان کے خیال پر کوئی پابندی تو عائد نہیں کرسکتا۔ جین صاحب کی فکر بہت زرخیز ہے، انہیں اس طرح کے شگوفے چھوڑنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ چونکہ انہوں نے منصوبہ بند طریقے سے پہلے نتیجہ نکالنے کے بعد اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تحقیق کا آغاز کیا ہے تو اس کے نتائج ظاہر ہیں۔ "غلط بیج بونا اور پھر اس کی آبیاری کرنا اور پھر دکھ کا شجر اگانے میں یہ مہارت حاصل کرنا شاید جین صاحب پر ختم ہے۔ ہر وہ سطر اور ہر وہ مضمون جو مسلمانوں یا اردو کے خلاف لکھا گیا ہو، جین صاحب کے مطالعہ کے لائق ہوتا ہے اور اس سے وہ خوب لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ امریکہ کی آزادی تحریر کی داد تو بہر حال جین صاحب دیں گے ہی، اپنے وطن کو چھوڑ کر آرام و آسائش اور دولت و ثروت کی طمع ہی تو انہیں امریکہ کھینچ کے لے گئی ہوگی تو اس لحاظ سے اب جین صاحب امریکی شہری بن گئے ہیں۔ اب امریکہ کی تعریف ان کے لیے فرائض میں شامل ہے تو یہ تعجب خیز بات نہیں ہوگی۔"

یہاں مسلمانوں کے تعلق سے ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ میں سارے مسلمانوں کی ذمہ داری تو نہیں لے سکتا، لیکن ایک آدھ فیصد کو چھوڑ کر سارے مسلمانوں کے تعلق سے مجھے یقین ہے کہ انہیں خدا نے عقل سلیم دی ہے اور وہ دل و جان سے اپنے ملک ہندوستان کو عزیز رکھتے ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں یا ایک آدھ فیصد تو ہندو بھی ملک دشمن ہوسکتا ہے جو رشوت خوری (Corruption) کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے حوالے سے جین صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا جواب خود ستیہ پال آنند نے کتاب نما (دلی) کے جولائی ۲۰۰۶ء کے شمارے میں دیا ہے۔ اس سے وضاحت ہوجاتی ہے کہ جین صاحب کے تخیل کی اڑان بہت اونچی ہے اور وہ بے سر و پا باتیں لکھنے کے عادی ہوگئے ہیں، یہ ایک ذہنی بیماری ہے۔ ہاں مگر واقعتاً

جین صاحب نے جو لکھا ہے وہ صحیح ہے تو اس برائی کو تسلیم کرتے ہوئے افسوس کرنا چاہیے۔ اسلام کی ستائش اگر اس کا سیاق صحیح ہے تو اس میں مجھے کوئی برائی نظر نہیں آتی لیکن غیر مسلموں کی جھوٹی ہجو اگر ہے تو اسے جہل ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہاں البتہ یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ خود رسول اکرمؐ نے غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ رواداری کا سلوک کیا اور اسی کی تعلیم دی۔ ہندوستان سے انہیں خوشبو آنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ گیان چند جین کو اس خوشبو کا اور اسی طرح کے بے شمار واقعات کا ذکر کرنا چاہیے تھا، افسوس کہ گیان چند صاحب کی فکر ہی منفی ہے تو ظاہر ہے یہ مرض لاعلاج ہے۔

ہندوستان میں اردو کے دو واضح زمروں کا جہاں تک سوال ہے اور مسلمانوں کے بارے میں جو بھی اپنے تاثرات کے موتی پروئے ہیں، ممکن ہیں وہ صحیح ہوں لیکن اپنی دانست میں جو توصیفی کلمات لکھے ہیں وہ صحیح نہیں۔ "سیاست دانوں کی احتیاط" اور "کھلی کتاب" ہونا تو یقیناً مستحسن بات ہے، مگر بلند بانگ دعوؤں کے باوجود وعیدار صحیح نہیں ہوتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ اپنی رعونت کو پردوں میں چھپانے کے لیے "کھلی کتاب" ہونے یا (Free Frank) ہونے کی بات کرتے ہیں۔ جین صاحب بدھ کو پیدا ہوں یا کسی اور دن، یہ ساری گفتگو مضحکہ خیزی سے زیادہ نہیں ہے۔

جہاں تک مسلم اقلیت کے پژمردہ ہونے کی بات ہے، یہ بھی نصف افسانہ ہے۔ پاکستان کی تحریک جیسی بھی رہی اور جو بھی اس کا ذمہ دار ہو یہ مسلمانوں کے علمائے کبار کی رو سے بے یقینی کی کرامت ہے۔ جمیعت العلماء ہند اور دیوبند کے علماء نے ہمیشہ پاکستان اور تقسیم ہند کی مخالفت کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سب سے زیادہ تیر کھائے، نہرو، پٹیل اور سارے کانگریسیوں نے تقسیم ہند کو قبول کیا تاکہ کوئی کچھ بنے اور کوئی کچھ ...... جسم لہولہان تھا تو صرف آزاد کا اور روح زخمی تھی تو ابوالکلام کی۔ وہ واحد شخص تھا جو آخر تک تقسیم کے خلاف آواز بلند کرتا رہا۔ انہوں نے دو قومی نظریے کو بھی قبول نہیں کیا اور ہمیشہ "متحدہ قومیت" کا پیغام سناتے رہے، جو اس وقت بھی سچ تھا اور آج بھی سچ

ہے۔ جین صاحب اگر تحریک آزادی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے اور سنجیدگی سے کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ محمد علی جناح سے پہلے دو قومی نظریہ ٹی۔ ڈبلیو۔ ہولڈرنیس (T.W. Holderness) نے اپنی کتاب Peoples of Problems of India میں پیش کیا تھا جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ ہندو اور مسلم فرقہ پرستوں نے اسی سامراجی فکر رکھنے والے مورخ سے غلط روشنی حاصل کی تھی۔ جینت گڈکری نے اپنی کتاب Hindu Muslim Communalism میں Holderness کے حوالے سے لکھا ہے:

T.W. Holderness: Father of Two - Nation Theory

In the book, Peoples and Problems of India, published in the year 1923, its author, Sir T.W. Holderness, first mooted the idea that Hindus and Muslims are and regard themselves as different nations. Both Muslim and Hindu communalists have, drawn the inspiration from this imperialist historian and ideologue. Holderness has observed:

"From the invasion of Babar to the deathh of Aurangzeb, was a period of one hundred and eithty years. During this time, the empire remained as it began, under the rule of foreigners. Though Rajputs were taken into military services of the state and Hindu scribes and financiers were taken in civil offices, the administration was

essentially foreign and Muhhammedan, (sic). The country was parceled into military commands, and commanders imported great numbers of men beyond the mountains. (There is absolutely no evidence to support this statemen and the large majority of the commanders were Hindus and the large majority of converts were, and even today and found to be, from Shudra castes.) In this way Muhammedan supremacy was established, ... To this day the effects are seen in the distribution of the Indian population in two great camps as it were, divided by religion, by tradition of government and to a large extent by nationality". (p.55).

At another place, Holderness adds:

"It is not surprising, though it may be regretted, that Muhammedans regard themselves as a separate communityy, with separate interests. In Europe we expect that sectarian differences, however acute, will be subordinated to nationality. In India, religion takes the place of nationality. As Lord Morley said in the House of

Lords to the second reading of the Indian Councils Bill, 'the differences between Muhammedanism and Hinduism is not a mere difference of article of faith or dogma. It is a difference in life, in tradition, in history, in all the social things as well as articles of belief that constitutes a community". (p.185)

Apart from these specific observations, the whole book is written on the basis of a racialist approach to history and mankind. The book also emphaises the division of Indian society into castes, languages, and races and the so-called antagonisms among them to such an extent to stress that there is not a single factor to wield India into one nation. According to the author, India becoming one nation would be disastrous for its people. A common cause of antiimperialist struggle, providing such a motivation at that time, was completely ignored by the author.

The argument that a nation is formed on the foundation of common or similar faith or religion, or a totally cohhesive culture or harmonious past,

itself was false and misleading. The history of formation of nations in Europe does not bear witness to its correctness. There were minorities in every nation when these nations were formed. The theory of one race, one religion, one culture, one past relating to one nation was also mischievous, because such a view even during those days was resulting in fascist ideology in Europe, based on hatred for Jews. However, this ideology was useful to British and other imperialist rulers for perpetuating their colonial rule and unfortunately, they had ideological and political followers in the communalists and orthodox intellectuuals in India.

It, however, took the long years of 1923 to 1938 for the 'two nation' theory to take root in Indian Soil. It was only after the defeat of both the communalists in the 1937 elections, that communalists adopted this virulent ideology for attaining their political goals.

It is no doubt truue that M.A. Jinnah and his Muslim League were mainly responsible for the

partition of India, as shown in the previous chapter. However, the Hindu communalists also have to share the blame for supporting the 'two-nation' theory promoted by the British imperialists, and their ideologues. Savarkar in his presidential address to the Hindu Mahasabhha conference of 1939, called upon his followers to accept the bitter truth that Hindus and Muslims are two nations:

"I warn the Hindus, that the Muhammedans are likely to prove dangerous to our Hindu Nation and the existence of a common Indian state, even if and when England goes out... Let us bravely face the unpleasant facts as they are. India cannot be assumed toady, to be a unitarian and homogeneous nation, but on the contrary there are two nations in the main, the Hindus and the Muslims in India" (Hindu Rashtra Darshan, p.26)

Savarkar was at least prepared to give Muslims and Christians civil and political rights strictly on a one-man, one-vote basis, without any protection or reservation rights. At another place Savarkar

also assured them liberty of practicing their faith without offending the sentiments of Hindus provided that minorities remain strictly loyal to the Hindu Rashtra and refrain from entertaining any extra session of Hindu Mahasabha held in December 1939.

Golwalkar, however, declared.

"The non-Hindu peoples in Hindustan must either adopt the Hindu culture and language, must learn to respect and hold in reverence Hindu religion, must entertain no idea but those of glorification of Hindu race and culture, i.e., they must not only give up their attitude of intolerance and ungratefulness towards this land and its traditions, but also must cultivate the positive attitude of love and devotion instead - in one word, they must cease to be 'foreigners' or may stay in this country wholly subordinated to the Hindu nation, claiming nothing, deserving no privileges, far less any preferential treatment, not even citizen's." (We..., p.55-56).

It is not surprising that Golwalkar has expressed

admiration for Hitler and his Nazi regime for the extermination of Jews. In his We, And Our Nationhood Defined, written in 1939, Golwalkar said,

"Italy and Germany are two countries where 'the ancient race spirit' has re-risen, has once again roused itself... German race pride has now become the topic of the day. To keep the purity of the race and its culture, Germany shocked the world by her purging the country of the Semitic races - the Jews. Race pride at its highest has been manifested here. Germany has also shwon how well-nigh impossible it is for races and cultures, having differences going to root, to be assimilated into united whole, a good lesson for us in Hindustan to learn and profit by." (pp.40-41).

Some of the Muslim leaders also had similar wild dream of exterminating the other community where Muslims had a large majority. M.H. Gazdar, a League leader in Sind, told a League meeting in Karachi in March 1941, "The Hindus will have to be eradicated like the Jews in Germany, if they do

not behave properly."

(Quoted by W.C. Smith in Modern Islam in India, p.299).

At another place, Golwalkar clarifies his notion of Hindu Rashtra, in the following words;

"In Hindustan exists and must needs exist the ancient Hindu nation and nothing else but the Hindu nation... so long as they (i.e., non-Hindus) maintain their racial, religious, and cultural differences they cannot be but 'foreigners'. There are only two coureses open to the foreign elements; either to merge themselves in national race and adopt its culture, or to live at the sweet will of national race.. they must cease to be foreigners or may stay in the country wholly subordinated to the Hindu nation claiming nothing, not even citizen's rights... In this country Hindus alone are nation and the Muslims and others, if not actually anti-national, are at least outside the body of the nation." (see We..., pp.19,52,62).

Golwalkar and Savarkar suggested that to

Muslims in India, this is a sarai, or land of sojourn, while to Hindus, it was a home - and therefore this should be Hindi Rashtra. (See We... repeatedly and Hindu Rashtra Darshan, p.50).

Bhai Permananda, who goes ahead in theorising Hindu Rashtra, says,

"It cannot be accepted that the country was 'jointly owned' by those who either came running away from their countries and sought protection here (a reference to the parsis), or those descendants of Hindus who, for the greed of power or money, or out of fear, renounced their glorious faith and became converts, or those who are descendants of those barbarous invaders who spoiled our very sacred lands, demolished our temples, etc., etc. The country cannot belong to them; if they are to live here they must live here taking for granted that Hindustan is the land of Hindus, and no one else." (Where we differ, p.66).

The view that Muslims in India were foreigners or that this country does not belong to them on their conversion to Islam was found quite acceptable by

Muslim communalists in a different incarnation. Of course, the idea of excluding Muslims from India or their eradication was not acceptable to them, but Muslim communalists could conveniently use the plank of separate 'nation' on the basis of their complete 'sepaarateness' from Hindus. Thus, Jinnah asserted in 1941.

"Muslim, when he was converted, granted that he was converted more than a thousand years ago, bulk of them, then according to your Hindu religion and philosophy, he becomes an outcast and he becomes a Malencha ('untouchable') and the Hindus cease to have anything to do with him socially, religiously and culturally or in any other way? He therefore belongs to different order, not only religious, but social and according to you, he has lived in that distinctly separate and antagonistic social order, religiously, socially and culturally. It is now more than a thousand years that the bulk of Muslims have lived in a different world, in a different society in a different faith and different philosophy." (Ahmed jamil-ud-din, op.

cit., pp. 116-118).

Jinnah has pleaded for the separate state of Pakistan for the correct expression of Muslim national will. He accused the Congress of being a 'Hindu body' and being bent upon bringing in a democratic form of Government for establishing a Hindu Raj. "Democracy meant", he repeatedly asserted, "expression of national will. Where there were two nations with nothing in common, it was not possible to have democracy. The only answer was partition and Pakistan." (See ibid., Pp. 123, 139-140, 151-152, 161-162, 217-219, 239-240).

Savarkar's idea of Punyabha (sacred land) as a necessary aspect of Hindu Rashtra, is also not original, but borrowed from racialist ideologues of Europe. Savarkar held that converted Muslims, Christians and Jews, though belonging to the same ancestral 'blood', cannot be said to be basically part and parcel of Hindu Rashtra because their perceived holy places were outside India. (Pp.92-95 of Hindutva).

The same arguments were put forward against

the Jews by European fascists, whose 'holy land' was in Palestine. The programs against them in Europe and the extermination in Germany were also carried out in the name of strengthening the national cause. The racial views and national interests were always craftily mixed and presented to be one and the same was done by communalists in India, following the footsteps of fascists in Europe. If one reads the literature of fascists and communalists, one clearly finds that they have used the words race, religion, and nation indiscriminately together, as if they are endowed with similar meaning.

The historical premises of the two-nation theory has already been dealt with in an earlier chapter on 'Communal distortion of Indian History'. The argument about lack of cultural cohesiveness will be dealt with in the subsquent chapter on cultural nationalism.

On point must be stressed here. Savarkar and Golwalkar both got totally confused and had to do tight rope walking and precarious balancing when

they had to confront the caste factor and harmonise it with the concept of Hindu Rashtra and glorification of the past. Their historical view could not ignore the existene of the caste system and hence, it had to be made a part of the glorious tradition. Therefore, both of them, on the one hand, had to contend that the caste system had become an integral part of the Hindutva and Hindu Rashtra and defend the same as being a factor uniting all Hindus in one sound social structure. On the other hand, they had to admit that it is not unchangeable and may be discarded when people find it to be untenable. In the process they had also to praise the Manu Smruti, picking and choosing some of its verses without reference to context and intentionally ignoring those verses which are relevant but are highly virulent towards shudras and women. This wa a strategy meant to attract the masses to their organisations in the name of a coherent and glorious past, while retaining the support of reactionary Brahmans, feudal elements and

sectarian intellectuals. While arguing that chaturvarnya had become an integral and inseparable part of Hindu Rashtra, Savarkar quotes a verse from Manu Smruti, saying that the countries (Desha) where the chatruvarnya does not exist are called Mleccha and where it exists, is called Arya Desha-which is a superior one. (Hindutva, p.22-23, 33-34) (Hindu Rashtra Darshan, p.39).

Praising Varnashrama Vyavastha (i.e., division of people into four castes, Brahmins, Kshatriyas, Vaishyas and Shudras on the basis of birth, Savarkar says: "And thus we find that institutions that were peculiar marks of our nation were revived. Varnashrama Vyavastha could not be wiped away even under Buddhists way, and grew in popularity in such a way that kings and emperors felt it to be a distinction to be called its protectors."

Actually, in a later verse, Manu has named Shaka, Chaudra, Kamboja, Parada, Palhava, Kirata, Khasha, Darada as the Deshas ruled by Mlecchas.

گرو گولولکر اور ساورکر نے یہ بھی تجویز رکھی تھی کہ ہندوستان ہندوؤں کے لیے "گھر" یا مادرِ وطن ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کی حیثیت ایک سرائے کی ہے۔ لہٰذا ہندوستان ایک ہندو راشٹر ہے(۱)

بھائی پرمانند کا بھی نظریہ یہی تھا۔(۲)

جناح نے جو اس سے قبل راسخ قوم پرست تھے، ان حالات میں اپنے نظریے کو بدل دیا اور ساورکر اور بھائی پرمانند سے آواز ملانے لگے، لیکن شوکت اللہ انصاری جیسے دانشور بھی تھے جنھوں نے محمد علی جناح کے دوقومی نظریے کی شدید مخالفت کی۔(۳)

ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر، راج گوپال اچاریہ، بیندر چودھری نے بھی دوقومی نظریے کی حمایت کی تھی۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے البتہ بعد میں نظریے پر نظرثانی کی۔(۴)

گیان چند نے لکھا ہے کہ "ملک کی تقسیم ہونے پر مسلم قوم کو اپنے علاقے میں چلا جانا چاہیے تھا، لیکن ملک کے بڑے حصے میں وہ اپنے پرانے وطن میں بسے رہے۔ اس کا نفسیاتی اثر دو طبقوں پر پڑا۔"

پاکستان وہاں بسے ہوئے اکثریتی مسلمانوں کے لیے تھا، ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نہیں لیکن جو جانا چاہتے تھے وہ گئے جو اقلیت میں رہے اور آج بھی مہاجرین بن کر آباد ہیں۔ باقی کروڑوں ہندوستانی مسلمان پاکستان کیوں جاتے؟ ظاہر ہے انھوں

---

(۱) Ibid-page 157.

(۲) Hindu Rashtra Darshan page 50 with reference to: Hindu - Muslim Communalism page- 158.

تفصیلات کے لیے دیکھیے: ہندو مسلم کمیونلزم از جینت گڈکری ۵۹-۱۵۸

(۳) Pakistan - The Problem of India by Shaukatulla Ansari (Ref: Hindu Muslim Communalism by J. Gadkari - page 161.

(۴) Jayant Gadkari: Hindu - Muslim Communalism - page 162,63.

نے اپنے وطن عزیز کو نہیں چھوڑا، جذبہ حب الوطنی سے سرشار وہ یہیں رہے، تمام تر فرقہ وارانہ خطرات کے باوجود...... ہمیں اپنے بزرگوں نے بچپن ہی سے یہ سبق سکھایا تھا کہ حب وطن ایمان کا جز ہے۔ میرے نانا کی تاکید تھی کہ بمبئی میں رہنے کے باوجود سال میں کم از کم دو بار ہم اپنے گاؤں ضرور جائیں۔ (ہم کوکن کے دیہاتی اپنے گاؤں کو بھی ''وطن'' ہی کہتے تھے۔ یہ رواج اب بھی ہے)۔ جب ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن اس طرح بنائے گئے ہوں تو ان کا پاکستان جانا، الا ماشاء اللہ، کیوں کر ممکن تھا۔ یہاں میں ایک خاندانی واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ میرے خاندان میں سے صرف ہمارے ایک بھائی نے جو سرکاری ملازم تھے، ملازمت میں آئندہ ترقی کے امکانات اور روشن مستقبل، نیز ہندوستان میں فرقہ وارانہ فضا سے مایوس ہو کر پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ فیصلہ کر چکنے کے بعد وہ چچا اور ان کے خسر سے ملنے گاؤں گئے اور اجازت طلب کی۔ چچا متقی پرہیزگار، تہجد گزار تھے، باریش تھے اور صافہ باندھتے تھے، انہوں نے اپنے بھتیجے اور داماد سے پوچھا کہ آخر پاکستان ہجرت کرنے کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے شاندار مستقبل اور جان و مال کی حفاظت کی دہائی دی۔ تو پوچھا ''کیوں تم مسلمان ہو''؟ کہا جی ہاں، پھر پوچھا کہ ''کیا تم ایک اللہ کو مانتے ہو۔'' کہا، جی ہاں تو کہا کہ جب خدا ایک ہے اور وہی جان و مال کی حفاظت کرنے والا ہے، تو وہ پاکستان میں بھی حفاظت کرے گا اور وہی ہندوستان میں بھی کرے گا۔ پاکستان اور ہندوستان کے خدا الگ الگ نہیں ہیں''۔ مگر چونکہ ہمارے بھائی قطعی فیصلہ کر چکے تھے، پاکستان ہجرت کر گئے اور ہمیشہ پریشان ہی رہے۔

یہ واقعہ سنانے کا مقصد یہی ہے کہ ہندوستانی مسلمان جو یہاں رہے، انہیں یہیں رہنا چاہیے تھا، اپنے ملک عزیز میں۔ تقسیم کے ذمہ دار وہ نہیں تھے، تقسیم کے ذمہ دار ہندو اور مسلم سیاست دان تھے۔ ناعاقبت اندیشانہ سیاسی فیصلے تھے جس کے ذمہ دار ہندو بھی تھے اور مسلم لیگی مسلمان رہنما بھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور جمعیت العلمائے ہند کا میں

اس سے قبل ذکر کر چکا ہوں، جو تقسیم کے پرزور مخالف تھے۔

ڈاکٹر گیان چند نے صفحہ ۲۵ پر الف، ب اور ج کے تحت عجیب اور غیر ذمہ دارانہ اور اخلاق سوز باتیں لکھی ہیں:

الف: ہندو شرنارتھی خاتون جو جین صاحب کی رشتہ دار بھی تھیں اور خیر سے تعلیم یافتہ بھی ہیں، انہیں جین صاحب بتاتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان چونکہ ہندوستانی ہیں اس لیے پاکستان نہیں گئے اور یہ کہ تقسیم کے ذمہ دار سیاسی لیڈران تھے جو ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، عام ہندوستانی مسلمانوں کا تقسیم سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر اس طرح کا جواب دیا ہوتا تو یقین ہے کہ وہ خاتون مطمئن ہو جاتیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ گیان چند جین صاحب نے آگ بجھانے کی بجائے، آگ پر تیل ڈالا ہوگا۔

ب: ووٹ دینا جمہوری حق ہے۔ جو سیاسی پارٹیاں الیکشن لڑتی ہیں وہ جمہوری نظام کی قانوناً منظور شدہ پارٹیاں ہوتی ہیں اور رائے دہی Secret ballot paper کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ انتہائی بد اخلاقی کی بات ہے کہ کوئی کسی سے یہ پوچھے کہ اس نے کسے ووٹ دیا۔ جن طلبا نے اتحاد المسلمین کے امیدواروں کو ووٹ دیا، ان سے سوال جواب کر کے استاد نے اگل وایا ہوگا، طلبا نے بھی استاد کی عزت و احترام اور نفسیاتی دباؤ کے تحت ووٹ دینے کا "راز" افشا کیا ہوگا۔ یہ اخلاق سوز حرکت ہے کہ آپ طلبا پر دباؤ ڈال کر خالص نجی اور راز دارانہ باتیں دریافت کریں، پھر ان کو نوٹ کر کے ان کے خلاف استعمال کریں۔ یہ استاد کے شایانِ شان نہیں۔

ج: "ہندو، اردو ادیبوں میں اقلیت ہیں"...... گیان چند کی یہ فکر منفی اور متعصبانہ ہے۔ ہندو ادیبوں کا مسلمان ادیبوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا مسئلہ بھی جین صاحب کی تحقیق نہیں بلکہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ، افسانہ طرازی ہے۔ ادب میں ہندوؤں یا مسلمان سب کا تعلق اردو برادری بلکہ مذہب اردو سے رہا ہے۔ جین

صاحب نے "شریر عناصر" کی وضاحت نہیں کی۔ شریر عناصر ہر طبقہ میں ہوتے ہیں، کیا ہندی یا دوسرے لسانی حلقوں میں نہیں ہیں؟ چکبست، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، جگن ناتھ آزاد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور دوسرے چوٹی کے غیر مسلم ادیب، مسلمان ادیبوں کی آنکھ کا تارا رہے ہیں، وہ مسلمان اردو ادیبوں کے دل میں بسے ہوئے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتادوں کہ فراق پر تفصیلی مضمون سب سے پہلے نیاز فتحپوری نے لکھا تھا "اردو کا ایک ہندو شاعر" یہ فراق کا پہلا بھرپور تعارف تھا۔ مرحوم مولانا مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی مالک رام کے گہرے دوست اور مداح تھے۔ کرشن چندر اور بیدی کی اردو کے ادیبوں کے دلوں پر حکمرانی تھی، پریم چند کی زبان کی تعریف اور توصیف علامہ شبلی نے بھی کی۔ بمبئی یونیورسٹی میں جب اردو چیئر قائم کی گئی تو کمیٹی کے مسلمان ادیبوں اور شاعروں نے ہی اس چیئر کو "کرشن چندر چیئر" کے نام سے منسوب کیا۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ گیان چند جین کا نام بھی اس زمرے میں شامل تھا، اردو والوں نے ان کی ہر طرح سے عزت افزائی کی اور پذیرائی بھی، اب اگر ان کی یادداشت کمزور ہوگئی ہے غالباً!...... یا یہ محض ان کی طبیعت میں شرارت کا عنصر ہوسکتا ہے۔

گیان چند جین نے ہندو ادیبوں کو بھی زمروں میں تقسیم کیا ہے، یہ ساری گفتگو (ص ۲۶) بھی شرارت اور سازش سے کم نہیں ہے۔ تفصیلات میں جانا وقت ضائع کرنا ہے...... گوپی چند نارنگ کو جین صاحب نے "ہندو" ادیبوں کے زمرے میں رکھا ہے، حقیقت کیا ہے معلوم نہیں۔ اگر وہ مسلمان نہ بھی ہوئے ہوں، تو وہ ہمارے لیے اردو تہذیب کے پروردہ یعنی مشرف بہ اردو بھائی ہیں۔ نارنگ نارنگ ہیں انہیں ہندو مسلمان کی عینک سے کوئی نہیں دیکھتا، یہ فکر گیان چند جین صاحب کو مبارک ہو۔ جین صاحب کو ان ہندوؤں سے چڑ سی معلوم ہوتی ہے جو نعت، منقبت، حمد اور مراثی لکھتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں کہ "اگر انہیں مسلمان دینی بزرگوں اور قائدوں سے اتنی ہی عقیدت ہے تو ان

کے عقائد، صحیفوں اور مسلک کو کیوں نہ قبول کریں" ۔ یہ عجیب و غریب منطق ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے رام، لچھمن، کرشن، ہولی، دیوالی، نانک جیسے بیشمار موضوعات پر نظمیں کہیں ہیں، اقبال نے رام، گرونانک، وشومتر، بھرتری ہری، سوامی رام تیرتھ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، مولانا فضل الحسن حسرت موہانی باقاعدگی کے ساتھ کرشن میلے میں شریک ہوتے تھے اور ان کی شان میں رطب اللسان رہے ہیں۔ یہ تو دوسرے رہنمایان دین کے لیے اظہار احترام وعقیدت مندی ہے، نہ ہندوؤں کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے، نہ مسلمانوں کے لیے ویدک دھرم کا پالن کرنا ضروری ہے۔ حافظ نے تو کہا تھا۔ ع

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

گیان چند صاحب کو ان ہندوؤں سے بھی شکایت ہے جو سچ بولنا پسند کرتے ہیں اور ان سے بھی جو سیکیولر (Secular) ہیں۔ انہیں منافرت پیدا کرنے والے اور متعصب لوگ پسند ہیں۔ گیان چند جین "ہندو مرثیہ گو کے خلوص کے قائل نہیں" ۔ (ص۔۲۶)۔ شاید انہیں معلوم ہوگا کہ ہندوؤں میں ایک فرقہ "حسینی برہمنوں" کا بھی تھا (مجھے نہیں معلوم یہ فرقہ اب بھی ہے یا نہیں)۔

گیان چند نے ڈاکٹر مسعود حسین خان کے حوالے سے خلقیہ اسلامی (Islamic Ethos) کی بھی بات کی ہے۔ اور اس ضمن میں مالک رام، جگن ناتھ آزاد اور آنند نرائن ملا کا ذکر کیا ہے۔ جو مثالیں دی گئی ہیں وہ صرف چند ہیں، صرف کشمیری پنڈت ہی نہیں، پنجابی ہندو بھی اس میں شامل ہیں۔ جین صاحب کو غالباً یہ بات معلوم نہیں ہے کہ ایسے بہت سے مسلمان بھی ہیں اس ملک میں جو مذہباً مسلمان ہیں لیکن ان کا ہندو خلقیہ (Hindu Ethos) ہے، کثیر تہذیبی اور کثیر لسانی ماحول کے یہ اثرات ہیں۔ کثیر تہذیبی سماج (Phural Society) کی یہ دین ہے مالک رام ہمارے محترم محقق ہیں، ان کے مذہبی عقائد جو بھی رہے ہوں، لیکن ان کے تعلق سے گیان چند انہیں مکار کہتے ہوئے

رک جاتے ہیں اور "ڈرپوک" کے خطاب سے نوازتے ہیں۔ مالک رام کے تعلق سے ساری گفتگو ٹھوس ثبوتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ قیاسات اور مفروضات پر ہے اور نازیبا حرکت ہے، جس کے وہ عادی مجرم ہیں۔ جہاں تک بیٹیوں اور پوتیوں کی زبان اول کی تعلیم کا سوال ہے تو کشمیری پنڈتوں کے یہاں آج سے پچاس سال قبل خواتین میں اردو پڑھنے کا رواج تھا، مگر عام طور پر کائستھوں میں مرد اردو پڑھتے تھے اور خواتین ہندی۔ کائستھ اردو کے چاہنے والے ضرور تھے، پھر گھر کی چہار دیواری سے باہر فارسی اور اردو ان کی ضرورت بھی تھی۔ مجلسی زندگی میں بھی یہی دو زبانیں رائج اور مقبول تھیں، مگر زبانوں اور تہذیبوں کو زندہ رکھنے کا کام خواتین (Women Folk) کرتی ہیں، لہٰذا خواتین کو ہندی پڑھائی جاتی رہی ہے۔ گیان چند صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ پنڈت نہرو کی شادی کا دعوت نامہ اردو میں شائع ہوا تھا (فارسی میں نہیں)، پنڈت موتی لال نہرو کی گفتگو اور خط و کتابت اردو میں ہوتی تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو کا ایک خط جو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ہے، میری نظر سے بھی گزرا ہے۔(۱)

نہرو خاندان کی مادری زبان اردو تھی، اس کا ذکر پنڈت جواہر لال نہرو نے خود بھی کیا ہے، ان کی شادی کا دعوت نامہ جس کا ذکر ہو چکا ہے اردو ہی میں تھا۔ کملا نہرو اردو اور صرف اردو پڑھتی تھی جب وہ علاج کے سلسلے میں سوئٹزرلینڈ (Sowitzerland) میں تھیں تو ان کے مطالعے کے لیے اردو کتابیں سوئٹزرلینڈ بھیجی جاتی تھیں۔ جب ۱۹۴۲ء میں اندرا گاندھی کی شادی فیروز گاندھی سے ہوئی تو شادی کا دعوت نامہ پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریر میں اردو اور دیوناگری رسم الخط میں چھپا تھا۔ پنڈت نہرو قومی زبان کی حیثیت سے گاندھی جی کے نظریہ ہندوستانی کے حامی تھے، لہٰذا اس دعوت نامہ میں اردو اور دیوناگری رسم الخط کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ زبان خالص اردو یا ٹھیٹھ ہندی نہ ہو بلکہ "گاندھیائی ہندوستانی" ہو۔

---

(۱) ایوان اردو، نئی دلی۔ پنڈت نہرو نمبر

جین صاحب نے کالی داس گپتا کے حوالے سے بھی جو باتیں لکھی ہیں وہ بھی زہریلی ہیں۔ مالک رام کے تعلق سے یہ باتیں جین صاحب اور گپتا جی کی گپ بازی سے زیادہ نہیں۔ گیان چند جین اور کالی داس رضا گپتا، ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ اور بقول

تو مرا حاجی بگویم من ترا حاجی بگو

کی یہ ایک عمدہ مثال ہیں۔ گیان چند جین زبان، ادب، تہذیب کے معاملہ میں ایک طرح کی ذہنی کشمکش اور انتشار کا شکار ہیں۔ مادری زبان کے معاملے میں یہ بات خصوصاً سامنے آتی ہے۔ کبھی وہ اپنی مادری زبان اردو بتاتے تھے، کبھی ہندی۔ اپنی بیوی کی مادری زبان البتہ ہمیشہ وہ ہندی ہی لکھاتے تھے۔ یہاں میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ۱۹۸۶ء میں حیدرآباد یونیورسٹی میں اردو نصاب کے حوالے سے NCERT کا ایک ورک شاپ (Work Shop) تھا، میں بھی مدعو تھا۔ دیگر مدعوئین میں ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم اور چند اور احباب تھے۔ ورک شاپ کے بعد مہمانوں کے اعزاز میں یونیورسٹی کی طرف سے ایک نشست منعقد کی گئی تھی اور سب کو اظہار خیال کرنا تھا۔ جب میری باری آئی تو میں نے ہندوستان میں لسانی ترسیل اور ابلاغ کے مسئلہ پر مختصراً گفتگو کی۔ یہ گفتگو گاندھیائی نظریہ قومی زبان "ہندوستانی" کے حوالے سے تھی۔ جین صاحب جب صدارتی کلمات کے لیے کھڑے ہوئے تو انہوں نے میری تقریر کے حوالے سے کہا کہ میں نے جو ہندوستانی کی بات کی ہے تو وہ نہیں سمجھتے کہ ہندوستانی کوئی چیز ہے، مزید انہوں نے کہا کہ یا اردو ہے یا ہندی۔ جب خطبہ صدارت ہو چکا تو میں نے ادباً جین صاحب سے آدھ منٹ کی اجازت چاہی کہ میں وضاحت کروں۔ میں نے جین صاحب سے دریافت کیا کہ ساہتیہ اکادمی (دلی) کے حالیہ Who's Who میں انہوں نے اپنی مادری زبان کے طور پر "ہندوستانی" درج کرائی ہے، تو یہ ہندوستانی کیا ہے۔ جین صاحب سے جواب بن نہیں

پڑا اور وہ خاموش ہو گئے۔ حاضرین نے میری اس حاضر دماغی کی بہت داد دی۔ یہ صرف ایک مثال ہے جین صاحب کے ذہنی رویوں کی، ان کا قدم جناب شیخ کے نقش قدم کی طرح ہے۔ مع

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

گیان چند جین کے دو چار بیانات "ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے" کی ضمن میں آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"کالی داس گپتا رضا نے ۵ جنوری ۲۰۰۰ء کے میرے نام خط میں لکھا ہے "میں نے دیکھا ہے کہ کسی مشہور شاعر یا ادیب کو بخشا نہیں گیا۔ صرف جگن ناتھ آزاد بچے ہیں، کیوں کہ انہوں نے اقبال کی پرستاری میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے" (ص ۴۸)۔ انہوں نے خط کے علاوہ شاعر، بمبئی اپریل ۲۰۰۲ء کا بھی حوالہ دیا ہے۔ کالی داس گپتا ابھی صاف ذہن کے آدمی نہ تھے، لیکن نجی خطوں کو استعمال کر کے جین صاحب نے مکتوب نگار کی شخصیت پر بھی سوالیہ نشان لگائے ہیں۔ انہوں نے ایک شریف انسان مانک ٹالا کو بھی اپنے ساتھ کوتاہ بینوں میں شامل کیا ہے۔ کسی نازک لمحے (Spur of the moment) میں بھی آدمی کا ذہن کسی خاص وجہ سے کچھ بول جاتا ہے یا لکھ جاتا ہے، نجی بات سمجھ کر، مانک ٹالا نے بھی لکھا ہوگا، تو گیان چند جین نے اسے استعمال کر کے غیر ذمہ دارانہ حرکت کی ہے۔ میں مانک ٹالا صاحب سے ذاتی طور پر واقف ہوں، وہ انتہائی صد احترام شخص ہیں اور ہندی سیاست کے ہوتے ہوئے وہ پریم چند کو بنیادی طور پر اردو کا ادیب مانتے ہیں۔ وہ سیکولرازم پر یقین رکھتے ہیں اور پریم چند کو سیکولر ادیب کی طرح سراہتے ہیں۔ گیان چند تو سیکولر ہندو ادیبوں پر طعن و تشنیع سے کام لیتے ہیں۔ جین صاحب نے گوپی چند نارنگ کے اہل خاندان کو اردو کی حد تک۔ مع

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

کہا ہے اور صحیح کہا ہے، لیکن "خدا کا شکر ہے" کہنے پر بین السطور میں وہ مسز

نارنگ سے ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ مسز نارنگ نے صحیح کہا کہ "خدا کا شکر ہے" کہنا محاورہ سا ہو گیا ہے۔ یہ محاورہ سا ہونا ہی، زبان کا ارتقا ہے۔ لسانی ادراک ہو تو یہ باتیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور محاورہ بن جانے سے آہستہ آہستہ زبانیں اپنی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ بھگوان، ایشور، رام، بھگوان کا تعلق معتقدات سے ہے۔ یہ لفظ بھی اردو کا حصہ ہیں، یہ تہذیبی لفظ ہیں، جیسے اللہ، رسول، نبی، نماز، زکوۃ وغیرہ اسلامی تہذیبی لفظ ہیں۔ یہاں پر ایک واقعہ بتانا مناسب سمجھتا ہوں۔ اللہ مذہبی لفظ ہے، خدا بھی اسی معنوں میں ہندوستانی مسلمان استعمال کرتے ہیں، جو دراصل فارسی سے اردو میں آیا ہے۔ میرے خالہ زاد بھائی نے مراٹھی میں مذہب اسلام پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ قرآن مجید کا مراٹھی نثر اور مراٹھی نظم میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ احادیث اور صحابہ کرام پر بھی مراٹھی میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ وہ مراٹھی کے جید عالم تھے، کام چلاؤ اردو اور فارسی بھی جانتے تھے۔ اکثر تقریبات میں جب انہیں تقریر کرنے کے لیے بلایا جاتا، جس میں سامعین کی اکثریت مراٹھی داں ہوتی، تو وہ "بھگوان"، "ایشور" اور "پرمیشور" جیسے الفاظ "اللہ" کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ کوکن میں شہر چپلون کے جلسے میں جب انہوں نے دوران تقریر مذکورہ الفاظ استعمال کیے تو سامعین میں بے چینی پیدا ہوئی، کچھ لوگ ناراض بھی ہوئے کہ "اللہ" کی بجائے بھگوان اور ایشور کیوں؟ نہ میرے بھائی نے غلط کہا نہ سامعین غلط تھے۔ مراٹھی اچھی جاننے کے باوجود وہ مذہبی موضوع پر تقریر میں تہذیبی الفاظ (Cultural Vocabulary) کو پسند کرتے تھے۔ ویسے یہ صحیح ہے کہ:

ایشور، اللہ تیرے نام، سب کو سن متی دے بھگوان

اس دعا میں گیان چند جین صاحب اور ان کے قبیلے کے لوگ بھی شامل ہیں۔

پنڈت ہری چند اختر کا شعر گیان چند صاحب نے خوب استعمال کیا ہے۔

خدا تو خیر مسلماں تھا، مجھ کو دیتا کیوں
مرے لیے مرے پرماتما نے کچھ نہ کیا

یہی بات اس کے الٹ بھی کہی جا سکتی تھی، مگر واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ شعر کو منفی انداز نظر سے نہیں بلکہ خالص ادبی اور شعری سیاق میں دیکھنا چاہیے تا کہ اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔

جین صاحب نے اردو اور ہندی کے مزاج میں فرق کی جو بات کی ہے، وہی سماجی لسانی اعتبار سے اردو اور ہندی کے تعلق سے اہم ہے اور دونوں زبانوں کی آزادانہ شناخت قائم کرتا ہے۔ جین صاحب نے اس ضمن میں اختلافی باتیں بھی کی ہیں، مگر اس وقت ان تفصیلات میں جانا ممکن نہیں۔ یہ اختلافی باتیں سماج لسانی مطالعہ کی دلچسپ بحثیں ہیں۔ دیگر شاعرانہ باتوں، شاعرانہ تعلیوں کو انہیں کے سیاق میں دیکھنا چاہیے۔ تلفظ اور تذکیر تانیث کے مسائل بھی ذولسانیت اور علاقائی اثرات کے ذیل میں آتے ہیں۔

جین صاحب ہر اس بات کو جو مسلمانوں اور اردو سے جڑی ہوتی ہے ترچھی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں تو اس منفی انداز نظر کو زیادہ اہمیت دے کر وقت ضائع کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، یہ ایک الگ مقالہ کا موضوع ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ دو لسانیاتی سکولوں میں لسانیات کی تربیت حاصل کرنے کے باوجود جس کا لازمی نتیجہ وسعت ذہنی ہونا چاہیے، گیان چند صاحب میں لسانی تنگ نظری زیادہ ہے، وسعت نظری نہیں پیدا ہو سکی۔

گیان چند جین ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں مسلمان اردو والے اپنی کمر پر دو قومی نظریے کا بھاری گٹھر اٹھائے پھرتے ہیں۔ ہندوستان نے یہ اچھا کیا کہ اپنے آئین میں دینی حکومت (Theocracy) کا تصور رد کر دیا اور غیر مذہبی آئین اختیار کیا۔ اس کی وجہ سے مسلمان اردو والے بجا طور پر اپنے لیے ہر قسم کے حقوق اور سہولتیں طلب کر سکتے ہیں۔

ایک عام ہندو کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر کیوں رکھا جائے" (ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب ص ۳۳)

جہاں تک دو قومی نظریے اور مسلمانوں کا تعلق ہے، گزشتہ صفحات میں بالتفصیل یہ بات واضح کی گئی ہے کہ دو قومی نظریے کے اولین گنہگار مسلمان نہیں ہیں اور اس خوفناک نظریے کو ہندو قائدین کی تائید بھی حاصل تھی۔ جہاں تک ہمارے آئین کا سوال ہے، یہ ایک غیر مذہبی (Secular) آئین ہے (اور جین صاحب کو سیکولر ازم اور سیکولر خیالات رکھنے والوں سے الرجی ہے)۔ مستحسن بات ہے اور ہندوستان کے لیے یہ فخر کی بات ہے۔ عام ہندو اگر واقعی وہ غیر مذہبی آئین کے مطابق ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے برابر حقوق اور سہولتوں پر انگلی اٹھاتے ہیں تو وہ ان کی وضاحت کریں اور ان کے شکوک و شبہات کو دور کریں۔ درس و تدریس سے تعلق رکھنے والوں کا یہ فرض ہے کہ عام لوگوں میں صحیح معلومات کی اشاعت کریں۔

گیان چند جین پھر لکھتے ہیں:

"میں اردو والے مسلمان دوستوں کی تحریریں دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ ان میں اب بھی علیحدگی پسندی دکھائی دیتی ہے جو پہلے تھی۔ ابنائے وطن کے بارے میں ان کے جذبات وہی ہیں جو ہندوستان کے باہر کے اردو والوں کے ہیں۔ ہندی کے لیے اب بھی وہی جذبہ ہے کہ متعصب ہندوؤں نے اسے اردو کے مقابلے میں مصنوعی طور پر گھڑ لیا" (ایک بھاشا: دو لکھاوٹ ص ۳۳)

مجھے نہیں معلوم یہ کون سے مسلمان دوستوں کی تحریروں کی جانب اشارہ ہے، اگر کسی نے ایسی بات لکھی ہے تو وہ غلط ہے۔ مسلمان علیحدگی پسند ہرگز نہیں ہے نہ پہلے تھا۔ ابنائے وطن انہیں قریب آنے تو دیں، مسلمان وطن پر جان نچھاور کر سکتا ہے اور اس

کی محبت کو جزو ایمان سمجھتا ہے۔ یہاں میں ایسے درجنوں واقعات پیش کر سکتا ہوں کہ مسلمانوں نے اپنے دوستوں اور پڑوسیوں سے دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھایا تو انہیں جھڑک دیا گیا، ان کے ساتھ ذلت آمیز برتاؤ کیا گیا، ہاں ایسے بھی لوگ ملے جنھوں نے محبت کا جواب محبت سے دیا اور اپنے پن کا اظہار کیا۔ مجھے نہیں معلوم جین صاحب علمی و ادبی حلقے کے مسلمانوں کے علاوہ عام مسلمانوں سے کتنے واقف ہیں (سوائے طلبا کے جنہیں وہ غلط طور پر استعمال کرتے تھے، جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے)۔

میں عام ہندوؤں کا پڑوسی اور دوست رہا ہوں اور میں نے خود عید، بقر عید کے موقع پر ناروا سلوک دیکھا ہے۔ میرے بزرگ اور کرم فرما، نامور مورخ اور عالم، اردو اور مراٹھی کے ادیب پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی نے ۱۹۸۷ء میں ایک ملاقات کے دوران، مسلمانوں کو ہندوؤں سے میل جول بڑھانے کی بابت گفتگو کی تو میں نے ان سے چند اپنے تجربات کے ساتھ ذلت آمیز چند واقعات بیان کیے۔ پگڑی صاحب نے غور سے میری باتوں کو سنا اور کہا کہ یہ افسوس ناک بات ہے اور اپنے مشورے پر کسی قدر شرمسار بھی ہوئے۔ جین صاحب! آپ عملی دنیا میں آئیے اور دیکھئے کہ ہمارے سماج میں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ جین صاحب کی کتاب تو ابھی ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی، کیا انہیں حالیہ گجرات کے فسادات کا علم نہیں ہے؟ اس سے قبل بھی ایسے بے شمار خوں ریز واقعات سے مسلمانوں کو گزرنا پڑا ہے۔ یہ رتھ یاترائیں ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب لائیں گی یا دوری پیدا کریں گی؟...... بہر حال میرا خیال ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کو اسی ملک میں جینا ہے۔ یہی ہمارا ملک ہے اور ہم دونوں کو اپنے اپنے رویے بدلنے ہوں گے تاکہ ہم سکون اور اطمینان کے ساتھ باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ جمہوریت میں اکثریت کا فرض اور ذمہ داری ہے کہ وہ اقلیت میں احساس تحفظ اور جینے کا حوصلہ اور اعتماد پیدا کرے۔

اردو کے تعلق سے ہندوستانی مسلمان تحفظ چاہتے ہیں، اس کی ترقی اور فروغ

چاہتے ہیں۔ ہندی کے لیے ان کے دلوں میں کوئی تعصب نہیں ہے، قومی لسانی پالیسی کے تحت وہ ہندی اور علاقائی زبانوں کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تو کثیری لسانی ماحول میں اقلیتوں کا مقدر ہے۔ انہیں سرکاری زبان ہندی اور علاقائی زبانوں کے ساتھ میل جول بڑھانا ہے اور بڑھا رہے ہیں۔ ہندی میں اب کئی مسلمان ادیب لکھ رہے ہیں۔ یہی حال علاقائی زبانوں کا بھی ہے۔ اگر کوئی آنکھ بند کر کے دیکھنا چاہے تو اسے کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت ہے، ورنہ وہ عوام کو گمراہ کرنے کے مرتکب ہوں گے۔ جین صاحب کے اس کتاب کے مفروضات یکسر گمراہ کن ہیں، حیرت ہوتی ہے۔

گیان چند جین صاحب نے ان کے مضامین کی عدم اشاعت کا فرضی قصہ بھی بیان کر دیا ہے، حالانکہ ان کے مضامین شمال تا جنوب بھی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ آئے دن "ہماری زبان" میں ان کے خطوط چھپتے رہتے ہیں۔ مضامین ہوں یا خطوط کی اشاعت یہ ان کے لیے ذاتی تشہیر کا ذریعہ بھی ہیں اور جین صاحب اس میں ہر طرح سے کامیاب ہیں۔ کامیاب Publicist ہونے کی تازہ مثال زیر نظر کتاب کا "ختم کلام" ہے جو "ہماری زبان" دلی اور "سب رس" حیدرآباد میں شائع ہوا۔ ممکن ہے اردو کے دو چار اور رسالوں میں بھی شائع ہوا ہو۔

گیان چند جین صاحب کی یہ بات کہ اردو کے سکالرس یہ سمجھتے ہیں کہ:

"متعصب ہندوؤں نے اسے (ہندی) اردو کے مقابلے میں مصنوعی طور پر گھڑ لیا" غلط نہیں ہے۔ ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر سنتی کمار چٹرجی کے بیانات موجود ہیں۔ اور کئی دیگر عالموں نے اس کی طرف واضح طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کا ذکر اگلے صفحات میں کیا جائے گا۔

گیان چند جین کی تمہید کا ایک حصہ "استاد اور شاگرد کا مکالمہ" ہے۔ میں ذیل میں صرف استاد محترم کے جواب کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ یہ عرض کروں کہ یہ مکالمہ

فرضی مکالمہ ہے اور کتاب کو ڈرامائیت عطا کرتا ہے۔

● جین صاحب نے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ملک اگر تقسیم نہیں ہوتا تو قومی زبان ''ہندوستانی'' ہوتی۔ چونکہ ملک تقسیم ہوا لہٰذا قومی زبان اتفاق رائے سے ہندی بنی لہٰذا اب اس مسئلے پر کسی نظرثانی کی ضرورت نہیں'' کے بعد مذکورہ ''افسوس'' انتشار ذہنی کی مثال ہے۔ ہندی تو اب قومی نہیں بلکہ سرکاری زبان ہے، اس پر نظرثانی کا وقت گزر چکا، لیکن ہندی رنگ ڈھنگ Texture پر اب بھی نظرثانی کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی سے میری طویل گفتگو ہوئی تھی ان کی کتاب ''India: A Poly, lot Nation & Its Linguistic Problems....'' پر مجھے ایک مختصر پیش لفظ لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی تو میں نے یہ بات اس میں لکھی تھی، یعنی نظرثانی کی بات۔ چٹرجی صاحب میری اس رائے سے کلی طور پر متفق تھے اور کہتے تھے کہ یہ صحیح ہے۔ ہندی، ہندوستانی رنگ کی ہونی چاہیے جس کی وضاحت ہمارے آئین میں بھی کی گئی ہے۔ سرکاری لسانی فیکٹری چاہے اسے نظر انداز کرے لیکن ذرائع ابلاغ اور عوام کی زبان ہندوستانی ہی ہے، جس کا سارا جھکاؤ اردو کی طرف ہے۔ ہندی فلموں کی زبان بھی وہی ہے، یعنی اردو آمیز ہندی یعنی ہندوستانی۔ ان کے جواب میں بھی تضادات ہیں، لیکن میں ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ جین صاحب نے لکھا ہے کہ:

''اس کے نتیجے میں ہندوستان میں دو قومی زبانیں ہندی اور اردو ہوں گی۔''

جین صاحب کا خیال ہے کہ ''ہندوستان میں کون اس کے لیے تیار ہوگا، جبکہ پاکستان میں صرف اردو ہوگی۔'' پاکستان سے مجھے کوئی سروکار نہیں، ممکن ہے اردو کے ساتھ سرائیکی ہو، مگر ہندوستان میں ہندی کے ساتھ اردو کیوں نہیں ہو سکتی: ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے، اس میں ایک سے زائد قومی زبانیں ہو سکتی ہیں: سوئٹزرلینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے، اس چھوٹے ملک کی چار قومی زبانیں ہیں۔

۱۔ سوس، ۲۔ ایڈش، ۳۔ اطالوی، ۴۔ جرمن

کینیڈا میں دو سرکاری زبانیں ہیں، انگلش اور فرانسیسی

اگر ہم اپنے ملک کے بڑے ملک ہونے پر فخر کرتے ہیں اور بجا طور پر، اور کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت پر فخر محسوس کرتے ہیں...... تو ایک بڑا ملک اور بڑی ہندوستانی قوم ہونے کے ناطے بڑا دل اور بڑا دماغ نہیں رکھ سکتے؟

"جن لیڈروں کے صبح کل بیانات نقل کیے گئے ہیں انہوں نے اب اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہا ہے۔ جس میں ہندوؤں کی کوئی دین نہیں"۔

جین صاحب محترم! اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک سرمایہ ہے، یہ کھڑی بولی کی اولین شکل ہے، جس میں ہندو اور مسلمانوں کا برابر حصہ ہے۔ یہ رابطے کی زبان ہے۔ اگر کسی نے اسے صرف مسلمانوں کی زبان کہا ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ سرتیج بہادر سپرو نے اسے مشترکہ تہذیب کا ناقابل تقسیم ورثہ کہا تھا، پنڈت نہرو نے اسے اپنی مادری زبان مانا تھا۔ آزادی سے قبل یہ سکولوں کا ذریعہ تعلیم رہی ہے، جس میں ہندو اور مسلمان طلبا دونوں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ صورت حال شمالی ہندوستان تک محدود نہ تھی بلکہ بمبئی کے انجمن اسلام کے سکولوں میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ہندو بچے زیر تعلیم رہتے تھے۔ حیدرآباد کا بھی یہی حال تھا۔ یہاں تو عثمانیہ یونیورسٹی قائم تھی جو صرف مسلمانوں کے لیے نہیں تھی، ذریعہ تعلیم اردو تھا اور ہندو اور مسلمان بھی زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر اور وکیل بنتے تھے اور ہندوستان عزیز کا نام روشن کرتے تھے۔ نول کشور تھے جو اردو کتابوں کے ہندوستان میں سب سے بڑے ناشر تھے، دیانرائن نگم تھے جو مشہور زمانہ جریدہ "زمانہ" مرتب کرتے تھے، بے شمار اردو کے شاعر اور ادیب تھے جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہاتھ ملا کر چلتے تھے۔ اور جان محفل تھے۔ اردو اور ہندی میں تفریق کے خلاف بھی مسلمانوں کے ساتھ آواز اٹھانے میں وہ شریک تھے۔ یہ فہرست شاعری، ادب (نثر)، صحافت کے اعتبار سے بہت طویل ہے۔ پریم چند اردو زبان و

ادب کا عظیم ورثہ ہیں۔ وہ اصلاً اردو ہی کے ادیب ہیں، ہندی میں ان کی حیثیت مہاجر ادیب کی ہے (دیکھیے مانک ٹالا کی تصانیف)۔ آج سے چند سال قبل تک اردو ادب میں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا طوطی بولتا تھا، آج گوپی چند نارنگ اسی آن بان شان سے اردو ادب میں اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں۔ پریم چند کی ہندی تحریریں اقبال ورما سحر، ہنگامی وغیرہ کے تراجم ہیں۔ وہ (پریم چند) روانی کے ساتھ صرف اردو لکھ سکتے تھے، ہندی نہیں...... سمپورنا نند نے اردو کے خلاف ایک محاذ کھولا تھا اور اردو کے خلاف مضامین لکھ رہے تھے (۱۹۵۵ء) تو دلی سے شائع ہونے والے رسالے "شاہراہ" میں فراق گورکھپوری نے اس کے مسکت جوابات دیئے اور لکھا کہ "پریم چند کو پریم چند اردو نے بنایا"۔ اردو مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی احسان مند اور مرہون منت ہے۔ جہاں تک اردو تحریک کا سوال ہے۔ یہ کوئی تحریک نہیں، انجمن ترقی اردو ہند اردو کے فروغ کے لیے ایک ادارہ کے طور پر قائم ہوئی، اسی طرح جس طرح ناگری پرچارنی سبھا، بنارس، ہندی کے فروغ کے لیے قائم ہوئی۔ اردو تحریک، اردو کی خود اندرونی طاقت رہی ہے، ہاں البتہ، ہندی کے لیے تحریک کی ضرورت تھی جو ناگری پرچارنی سبھا نے پوری کی، اس کا نشانہ اردو تھی۔ یہ حقیقت ہے ماضی میں ہندی کے عمائدین اردو کے عمائدین سے لڑتے تھے، اب اسی طرح انگریزی کے عمائدین سے لڑنا پڑ رہا ہے۔"

(ہندی نیشنلزم از آلوک رائے ص ۵ ترجمہ گیان چند)

استاد کا دوسرا جواب ملاحظہ فرمایئے:

اردو کے آداب و تہذیب کی ہندوؤں میں پسندیدگی کے بارے میں گیان چند جین کا خیال ہے کہ یہ "پسندیدگی اس انداز کی ہے جیسے کوئی فلم یا موسیقی کے جلسے سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔" اسلامی امرا یا اسلامی مذہبی ادب کی بات جانے دیجیے، اس میں دلچسپی صرف علمی سطح پر ہو سکتی ہے، عوامی سطح پر نہیں لیکن ہندو اردو کے آداب و تہذیب

سے یقیناً متاثر ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں۔ ہمارے ایک مراٹھی کے ادیب کیشو پروہت کو میں نے ہمیشہ یہ کہتے سنا کہ اردو زبان انہیں بے انتہا پسند ہے کہ وہ ادب کی زبان ہے۔ (ادب بمعنی آداب و تہذیب)، مراٹھی کے ممتاز ادیب پ۔ ل دیش پانڈے جن کی مراٹھی ادب میں ایک Legend کی حیثیت ہے۔ وہ اردو سے اس قدر متاثر تھے کہ اسماعیل یوسف کالج میں طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی کلاسوں میں باقاعدگی سے اردو کا درس لیتے تھے، فلم اور موسیقی کی طرح لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں، زبان و ادب کے نکات سمجھنے کے لیے۔ یہاں میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا:

ا۔ ایک گجراتی خاتون ڈاکٹر میرے آفس میں آئیں کہ انہیں اردو سیکھنی ہے۔ کیوں؟ کہا مجھے بہت پسند ہے میں نے وقت طے کیا۔ دوپہر کھانے کے وقفے میں آتی تھیں۔ میں نے ان کا ذوق و شوق دیکھا تو ہفتے میں دو تین بار کی بجائے صلاح دی کہ اگر وہ روزانہ آجائیں تو جلد اردو سیکھ لیں گی۔ وہ خوش ہوئیں اور روزانہ آنے لگیں۔ حروف تہجی سے ساتویں تک انہوں نے چھ میں سات کتابیں پڑھیں اور لکھنا بھی شروع کیا۔ پھر منتخب نظمیں، غزلیں، افسانے اور مضامین پڑھے اور پھر گجراتی میں اردو کے ترجمے کرنا شروع کیے۔ غالب، فیض، بہادر شاہ ظفر اور جگر کے گجراتی رسم الخط میں انتخابات شائع کیے اور وہ اردو تہذیب میں اس طرح رچ بس گئیں کہ انشاء اللہ، ماشاء اللہ، خدا حافظ، خدا کا شکر ہے جیسا محاورہ ان کی زبان پر تھا۔ ہمارے ایک مشترکہ دوست مشہور گجراتی شاعر ہریندر دوے تھے، انہوں نے گجراتی میں ایک تعارفی کتاب غالب پر بھی لکھی ہے، ان سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ شاعری کے شوق کی حد تک انہیں اردو سے دلچسپی تھی، مگر اردو تہذیب سے نہیں۔ ہماری دوست، دیوالی اور تہواروں کے موقع پر دیوالی مبارک، سالگرہ مبارک اور نیا سال مبارک کے ساتھ انشاء اللہ، ماشاء اللہ اور خدا حافظ کا

استعمال کرتی تھیں۔ انہیں خاتون ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ ہر چند روے ان سے ناراض ہوتے کہ یہ آپ مسلمانی لفظ کیوں استعمال کرتی ہیں۔ نئے سال کے لیے "نیوتن ورش" کہیے اور ہندوانہ شبد استعمال کیجئے۔ یہ اپنے اپنے سوچنے کے طریقے ہیں، لیکن جو اردو پسند کرتے ہیں وہ اردو تہذیب میں رچ بس جاتے ہیں، فلموں اور موسیقی کی طرح لطف اندوز نہیں ہوتے بلکہ اس کی لسانی جمالیات سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور اسے اپنا لیتے ہیں۔

۲۔ ایک مہاراشٹرین ڈاکٹر میرے پاس اردو سیکھنے آئے تو میں نے پوچھا کہ وہ اردو کیوں سیکھنا چاہتے ہیں؟ کہا کہ مجھے غالبؔ پڑھنا ہے۔ میں نے دیوناگری رسم الخط میں مطبوعہ دیوان غالبؔ کے حوالے دیے تو کہا کہ غالبؔ کو صرف دیوناگری میں پڑھنا، غالبؔ کے ساتھ زیادتی ہے، اسے اس کے اپنے رسم الخط میں پڑھنا چاہتا ہوں تاکہ زبان کی نزاکتیں بھی سمجھ سکوں۔

۳۔ گوورنج کے ایک اعلیٰ افسر میرے پاس اردو سیکھنے کی غرض سے آئے۔ وہ صرف انگریزی اور پارسی گجراتی جانتے تھے۔ ہندی سے بھی نابلد تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ ہندی تک سے واقف نہیں تو پھر اردو پڑھنے کا شوق کیسے ہوا۔ کہنے لگے کہ T.V پروگرام میں "محفل یاراں" کا پروگرام آتا ہے۔ سنا ہے کہ جو شخص انٹرویو لیتا ہے وہ اردو کا بہت بڑا شاعر ہے (سردار جعفری، یہ پروگرام پیش کرتے تھے) ان کے لمبے لمبے بال ہیں۔ جو زبان وہ بولتے ہیں میں نے سنا ہے کہ وہ اردو زبان ہے، مجھے وہ زبان سیکھنی ہے۔ زبان تو میں نہیں جانتا لیکن وہ زبان بہت میٹھی لگتی ہے۔"

میں نے ان صاحب کے ساتھ وقت طے کیا۔ انہیں بھی سات آٹھ کتابیں پڑھائیں، پھر ان کا تبادلہ پونے ہوا۔ اب بھی کبھی کبھار فون پر اپنی مشکلات کے حل تلاش کرتے ہیں۔

۴۔ شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی میں چند پنجابی خواتین، ماں، بیٹی اور بہو اور ایک عزیز نے ایک ساتھ اردو سرٹیفکیٹ کورس کے لیے داخلہ لیا۔ میں نے سارے خاندان کی اردو سے اس دلچسپی کی وجہ جاننی چاہی، تو کہا کہ ہمارے گھر کے سارے بزرگ اردو ہی لکھتے پڑھتے آئے ہیں۔ یہ ہمارے گھروں کی زبان ہے، ہمیں افسوس ہے کہ اب ہم اپنی زبان سے کٹ گئے ہیں۔ اردو ہمارا تہذیبی ورثہ ہے، لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ ہم اردو سیکھیں۔ اردو کے آداب و تہذیب ان کی زندگی کا حصہ تھے۔ ممکن ہے وہ بھگوان، ایشور، رام، بولتے ہوں کہ یہ تو تہذیبی و مذہبی لفظ ہیں، اردو اور ہر زبان میں تہذیبی زبان استعمال کرنے کی پوری چھوٹ ہے، آنکھیں کھلی اور دماغ روشن ہونے چاہئیں، اردو کسی کے دین اور دھرم میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتی، بہت وسیع القلب اور فراخ دل زبان ہے۔ جین صاحب اس نکتے کو ابھی نہیں سمجھے۔

جین صاحب لکھتے ہیں:

''تقسیم سے پہلے آخری مغل دور اور پھر انگریزی حکومت میں جس طرح ۱۲۔۱۵ فیصد مسلمانوں نے بہت بڑی زبان ہندی کے وجود کو جس جارحانہ انداز سے نظر انداز کرنا چاہا، اس کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا''۔ ادباً عرض ہے کہ آخری مغل دور اور انگریزی حکومت کے زمانے میں اردو ہندی، ہندوی، ریختہ اور ہندوستانی نام کی ایک زبان تو تھی۔ یہ ایک ہی زبان کے مختلف نام تھے (مترادفات) جدید ہندی نہیں تھی جسے رام گوپال نے This Hindi and Devanagari کہا ہے اور جس پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ سنیتی کمار چٹرجی نے بھی لکھا ہے کہ موجودہ ہندی، اردو سے الگ ہے اور اردو کی جگہ میں سنسکرت الفاظ سے وضع کی گئی ہے۔ ہاں البتہ برج اودھی جیسی ترقی یافتہ زبانیں تھیں جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے خوب لکھا تھا (آخری مغل دور سے پہلے)۔ جب اردو کے خلاف شمالی ہندوستان میں تحریک شروع ہوئی تو انگریزوں نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' (Devide and rule) کے پیش نظر جدید ہندی کی پشت

پناہی کی۔ فورٹ ولیم میں للولال اور سدل مشر نے انگریزوں ہی کی ایما پر جس زبان کا بیج بویا تھا اور جو برگ و بار پیدا کر رہا تھا اسے اردو کے خلاف پانی دے کر سینچا۔ جین صاحب کا بیان الٹی گنگا بہانے کے مترادف ہے۔ اردو نے جارحیت کا کام نہیں کیا، اپنی مدافعت کی۔ بھارتیندو ہرش چندر پیش پیش تھے۔ ستارہ ہند راجہ شیو پرساد بھی اس میں شامل تھے، لیکن نسبتاً میانہ روی کے ساتھ۔

جہاں تک شاگرد کا تیسرا سوال ہے، اردو کے مفروضہ دو مراکز دلی اور لکھنؤ کے بارے میں، گیان چند سے میں متفق ہوں کہ دلی اور لکھنؤ کی یہ لسانی مرکزیت ختم ہو گئی ہے۔ لیکن جس حقارت سے وہ جواب دیتے ہیں وہ علمی انداز نہیں مخاصمانہ انداز ہے۔ آزادیٔ ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد ہندی والوں کے ہاتھوں جو لسانی قتل عام (Linguistic Genocide) ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش سے سرکاری پالیسی کے تحت اردو کو تعلیم گاہوں سے نکالا گیا اور زور زبردستی سے ہندی کو اردو والوں کے گلے سے اتارا گیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندی بیلٹ (Hindi Belt) کہلائی جانے والی ریاستیں اردو ہندی بیلٹ یا ہندوستانی بیلٹ ہیں، جہاں آزادی سے پہلے سکولوں میں ساتویں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو اردو اور ہندی ایک ساتھ پڑھنے کے برابر موقع ر سہولتیں فراہم تھیں اور ہندی اور اردو دونوں برابر برابر ترقی پا سکتی تھیں۔ اکثریت کا نشہ چاہے جہاں بھی ہو برا نشہ ہوتا ہے، جس کی جارحیت سے اردو کو نقصان پہنچایا گیا۔ ابھی چند سال قبل اردو کو یوپی میں دوسری سرکاری زبان بنایا گیا، جو انصاف کا تقاضا تھا تو کیا کچھ واویلا نہیں مچایا گیا، کورٹ کچہری میں جا کر اس فیصلہ کو روکا گیا۔ یہ فاشست ذہنوں کا رویہ ہے۔ موجودہ بنگلہ دیش میں بنگالی کے ساتھ اردو کے نام سے ظلم روا رکھا گیا جو سراسر ناانصافی اور ظلم تھا۔

جہاں تک زبان کے استناد کا سوال ہے تو قدیم انسانی رویے بدل گئے ہیں۔ نہ دلی والوں کو فوقیت حاصل ہے نہ لکھنؤ والوں کو، عام پڑھے لکھے ہی سند ہیں، اس

کا علاقے سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن یہ مسئلہ صرف اردو کا مسئلہ نہیں ہے۔ مراٹھی، گجراتی اور دوسری زبانوں میں بھی مرکزیت اور معیار کا مسئلہ ہے جو کسی حد تک واجب بھی ہے۔ یہ مسئلہ قواعد اور قانون بنانے سے حل نہیں ہوگا۔ فراخ دل و ذہن سے ہوگا۔ باعزت رواداری (Respectful tolerence) اس مسئلے کے حل کی کلید ہے۔ لسانی مرکزیت کا مسئلہ یورپی ممالک میں بھی ہے۔ صرف اردو کا نہیں جو گیان چند جین صاحب سمجھ بیٹھے ہیں۔

جین صاحب نے شبیہ الحسن صاحب کی گفتگو اور سرور صاحب کے فقرے کا بھی لطف اندوز ہوتے ہوئے ذکر کیا ہے۔ شبیہ الحسن صاحب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کتابی زبان کے علاوہ کسی بولی سے آشنا نہ تھے، اس پر یقین کرنا مشکل ہے، لیکن طلاقت لسانی بھی قدرت کا تحفہ ہے۔ طلاقت لسانی فن بھی ہے جو ذاکرین حاصل کرتے ہیں، اس فن کی بہر حال داد دینی ہوگی۔ میں نے حیدر آباد میں علامہ فرخ کو سنا ہے۔ ان کی طلاقت لسانی بھی لاجواب ہے۔ ایسی تقریروں کو اسی مقصد سے سننا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ الفاظ کس طرح ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں یا بندوق کی نالی سے گولیوں کی طرح برس رہے ہیں۔ گیان چند صاحب اس بات سے واقف ہیں کہ زبانیں یا گفتگو اپنا سیاق وسباق رکھتی ہیں۔ ذاتی بھی ہوتی ہیں، برادری کے مخصوص حلقوں کی بھی تابعداری کرتی ہیں۔ ادبی اور علمی محفلوں میں الگ طور پر استعمال ہوتی ہیں اور بازاروں اور گلی کوچوں میں بھی اپنی سطح آپ تلاش کرتی ہیں۔ گفتگو کرنے والے اپنے مخاطب (Interlocutors) کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔

شاگرد کے ایک سوال کے جواب میں استاد (جین صاحب) نے اپنی دبی ہوئی خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ جنس اور عورت کے بارے میں گفتگو کرنے میں وہ بہت لذت محسوس کرتے ہیں۔ جہاں تک اردو غزل میں محبوبہ (طوائف) کا سوال ہے، وہ اردو تک ہی محدود کیوں؟ سنسکرت شاعری میں بھی اس کی بے شمار مثالیں مل جائیں گی۔

قدیم سنسکرت ادب میں گوشت پوست کی جوان، ناز وغمزہ والی عورت چھائی ہوئی ہے۔ یہ ساری باتیں بھی جین صاحب کو یقیناً معلوم ہوں گی۔ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے، ممکن ہے کہ اردو غزل کا محبوب (طوائف) سنسکرت ہی کے دروازے سے اردو میں داخل ہوا ہو۔

انگریزی اور اردو تہذیب میں بہت بڑا فرق ہے۔ اردو شاعری، بطور خاص اس کی تشبیہات، اشارے اور کنایے، زلف ورخسار، رقیب روسیاہ، یہ ساری باتیں تہذیبی فرق کی وجہ سے انگریزی کلچر کے لیے نامانوس ہیں۔ رالف رسل کے مشاہدات صحیح ہیں، شک ڈاکٹر گیان چند کے رویے اور نیت پر ہوتا ہے۔

جین صاحب جب یہ کتاب لکھ رہے تھے، تو انہیں معلوم تھا کہ وہ اشتعال انگیز کتاب لکھ رہے ہیں۔ قارئین کو یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتاب منصوبہ بند طریقے سے لکھی گئی ہے اور دوران ملازمت ہی سے جین صاحب طلبا، اساتذہ، احباب سے گفتگو کرتے ہوئے لطیف قسم کی گفتگو ہوتی ہے، Lighter Vein میں جس کے کوئی معنی نہیں ہوتے، تفنن طبع بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ ان کے شاگردوں اور رفقا واحباب کو شاید اس وقت اندازہ نہیں رہا اور انہیں معصوم سمجھ کر باتیں کیں جن کا غلط استعمال اس کتاب میں کیا گیا۔ اقبال جین صاحب کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے ہیں، جگن آزاد کا ماہر اقبالیات اور پرستار ہونا بھی انہیں پسند نہیں ہے، وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اسی طرح سوچیں جس طرح وہ سوچتے ہیں، یہ ممکن نہیں، مسلمان نہ ہندو، کسی اردو کے ادیب، نقاد اور محقق نے ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی ہے، جین صاحب کی یہ خام خیالی ہے کہ

مستند ہے میرا فرمایا ہوا
سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا

اقبال کے خلاف جین صاحب نے جو زہر اگلا ہے، اس کا جواب میرے دوست پروفیسر یعقوب عمر نے اپنی گرانقدر تصنیف "اقبال پر زعفرانی یلغار" میں دیا ہے۔ یقیناً یہ

کتاب ان کی نظر سے گزر چکی ہوگی۔

گیان چند نے اس سوال میں مانک ٹالا کے نجی خط میں (اگر وہ صحیح ہے) تو ان کو بھی مسلم دشمن ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ایسی باتیں عقل سے دشمنی ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

مسلمانوں اور اردو سے پوری طرح بغض و کینہ کا اظہار کرنے کے بعد انھوں نے جو وعظ فرمایا ہے، تضادات کے باوجود یہاں اس وعظ پر میں اپنی تحریر ختم کرتا ہوں۔ واعظ گیان چند جین فرماتے ہیں:

''مذاہب کا کامل انسان کائنات کی نعمتوں کا شعور رکھتا ہے۔ دوسروں کی خوشی میں اضافہ کرنے کی مسلسل کوشش کیجیے۔ یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم کسی کے دکھ درد اور پیڑا میں اضافہ نہ کیجیے۔ کسی کے لیے دل میں بغض و کینہ نہ رکھیے بلکہ مذہب، زبان، تقسیم ملک کے لیے بھی نہیں''۔ (ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب)

اس وعظ کے بعد غیر فرضی شاگرد کی زبان میں گیان چند جین درمدح خو مصروف ہوگئے ہیں۔

☆......☆......☆

دوسرا باب

طریق تحقیق

ڈاکٹر گیان چند جین اردو کے معروف محقق ہیں۔ ادب اور لسانیات دونوں میں درک رکھتے ہیں، ان کی علمی فتوحات میں ایک کتاب ''تحقیق کا فن'' بھی ہے۔ فن تحقیق پر اردو میں چند ہی کتابیں ہیں۔ سب سے پہلی کتاب غالباً ''مبادیات تحقیق'' ہے جو عبدالرزاق قریشی کی تصنیف ہے، پھر ایک مجموعہ مضامین ''رہبر تحقیق'' ہے جو لکھنؤ کے شعبہ اردو نے شائع کیا تھا۔ اس موضوع پر اردو کے دو جید محققین کی کتابیں بھی ہیں۔ ایک معروف محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی ''اصول تحقیق'' اور ...... دوسری، دوسرے معروف ومعتبر محقق رشید حسن خان کی تصنیف ''اردو تحقیق کے مسائل'' ہے۔ راقم الحروف نے بھی ۱۹۸۳ء میں ''ادبی اور لسانی تحقیق: اصول اور طریق کار'' مرتب کی تھی، جو طلبا اور اساتذہ میں بہت مقبول ہوئی۔ راقم کے ابتدائی مفصل مقالہ کو کتابی حیثیت سے بہت پسند کیا گیا۔ یہ مقالہ مقتدرہ، اسلام آباد (پاکستان) کی ڈاکٹر سلطانہ بخش کی مرتبہ کتاب ''اصول تحقیق......'' میں شامل ہے۔

جین صاحب اصول تحقیق رفن تحقیق سے بھی واقف ہیں اور عملی تحقیق کا بھی وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ اور دو ادب'' میں ایک باب ''طریق تحقیق پر دوسری نظر'' اسی پس منظر میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ فن تحقیق میں پیش کیے گئے نظریات کے بعد جو انہیں نئی روشنی حاصل ہوئی، ''دوسری نظر'' اسی کا تتمہ ہے۔ اس باب میں

اصولِ تحقیق کے حوالے سے جین صاحب کی گفتگو نہایت کارآمد اور عملی نقطۂ نظر رکھتی ہے۔ انہوں نے قدیم روایتوں کی بنیادوں پر اپنے جذب و یقین کا اظہار کرتے ہوئے، ان کو اپنانے کی وکالت کی ہے۔ اس ضمن میں محقق کی غیر جانبداری کا بھی ذکر کیا ہے اور تحقیق میں غیر جانبداری کو بنیاد بتایا ہے۔ اردو اور ہندی کے مسئلہ پر مشہور امریکی سکالر کرسٹوفر کنگ (Christopher King) کی کتاب "ایک زبان، دو رسم الخط" One Language Two Scripts کے حوالے سے لکھا ہے:

"کوئی سکالر خواہ بیرونی، خواہ ہندوستانی، کبھی بھی پوری طرح غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ اس کا کسی خاص زمانے میں کسی خاص مقام پر پیدا ہونا، اس کی تعلیم وغیرہ غیر شعوری طور پر اس کے تجزیے کو متاثر کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ معروضی ہونے کے معنی یہ نہیں کہ اپنا موقف ہی اختیار نہ کرے۔"

کرسٹوفر کنگ کا بیان تحقیقی نقطۂ نظر سے ایک حقیقت ہے، لیکن محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے موقف کے بارے میں مبالغہ نہ کرے اور اس آخری جملے کا ناجائز استعمال نہ کرے ورنہ تحقیق ریت کی دیوار ثابت ہوگی۔ جین صاحب نے کرسٹوفر کنگ کے حوالے سے قبل لکھا ہے: "ایک مورخ اپنے شعور کی حد تک غیر جانبداری اور دیانت داری سے کام لیتا ہے، لیکن اس کے تحت الشعور اور اجتماعی لاشعور پر اس کا قابو نہیں چلتا۔"

جین صاحب نے زیرِ نظر کتاب میں کرسٹوفر کنگ اور خود اپنے بیانات سے "بے قابو" ہونے کا جواز پیدا کر لیا ہے۔ چنانچہ گیان چند کی یہ کتاب بے قابو ہونے کی ایک بین مثال بن گئی ہے۔

جین صاحب نے ماضی کی حکومتوں کے تعلق سے مورخین کے نقطۂ نظر کی بھی بات کی ہے، جو مختلف ہو سکتے ہیں۔ جین صاحب کے نقطۂ نظر سے نہ کلی اتفاق ممکن ہے نہ کلی انکار۔ تحقیق میں ذرائع کی عدم موجودگی یا پہلے سے کسی نتیجے پر پہنچ کر اسے ثابت کرنے کا

اندازِ نا روا ہے۔ اپنے شعور، تحت الشعور اور اجتماعی لاشعور کو قابو میں رکھنا ضروری ہے، ورنہ تحقیق سے جو نتائج برآمد ہوں گے، وہ خطرناک نتائج پیدا کریں گے۔

گیان چند جین نے اس باب میں بہت ساری باتیں اپنے موقف کی بنیادیں مضبوط کرنے کی خاطر سوانحی انداز کی لکھی ہیں۔ قاری کو ان نجی سوانحی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور مختصر باب کا بہت بڑا حصہ بے ربط سا لگتا ہے، بقول وجہی:

جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس
بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس

والا معاملہ ہے۔ البتہ "ہندوستانی" کے سرکاری زبان ہونے اور کاسٹنگ ووٹ کا جو معاملہ ہے، وہ مستند نہیں ہے لیکن یہ افواہ گھڑی نہیں گئی ہے۔ (خاص طور سے اردو والوں کے تعلق سے یہ صحیح نہیں) یہ بات ہندو ہوں یا مسلمان سبھی کی معلومات کا حصہ ہے۔ ۱۹۷۶ء میں مشہور ماہر معاشیات اور سابق وزیر تعلیم حکومت ہند ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ کو میں نے بمبئی میں مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے تحت مہاتما گاندھی میموریل لیکچرس کے لیے مدعو کیا تھا، اس موقع پر ذاتی طور سے Dr. Rao نے مجھے بتایا کہ ہندوستانی بحیثیت قومی زبان کے تعلق سے صدر، ڈاکٹر راجیندر پرساد کے کاسٹنگ ووٹ کی بات غلط ہے۔

جین صاحب کی پیش نظر کتاب پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے یہاں علمی کجی ہے، لیکن ڈاکٹر راؤ کی بات صحیح ہے۔ لیکن اس میں بھی سہو یا مغالطہ ہے۔ قومی زبان ہندی راردو کے مسئلہ پر کاسٹنگ ووٹ کی بات پوری طرح غلط بھی نہیں ہے۔ اس میں تسامح ہے۔ یہ بات دراصل کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی نہیں کانگریس کمیٹی کی ہے۔ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر دستور ہند کی Drafting Committee کے چیئرمین تھے۔ قومی زبان کے مسئلہ پر "انگلش" یا کسی بھی "ہندوستانی زبان" کو قومی زبان بنائے جانے پر اتفاق رائے نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں دسمبر ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر امبیڈکر نے لکھا:

"It may now not be a breach of a secret if I revealed to the public what happened in the Congress Party meeting when the draft Constitution of India was being considered on the issue of adopting Hindi as the national language. There was no Article whih proved more controversial than Article 116 which deals with this question. No articles produced more oppisition, no article more heat. After prolonged discussion when the question was put, the vote was 78 against 78. The tie could not be resolved. After a long time when the question was put to the party meeting, the result was 77 against, 78 for, Hindi. Hindi won, its place as a national language by one vote. As chairman of the Drafting Committee, I had naturally entry to the Congress Party enclosuure." (Thoughts on Linguistic States, published by the author).

Mr. Frank Anthony said:

"As a member of the steering Committee - I was not a member of the Congress Party- I was invited to its deliberations. The decision to make Hindi

even as an official langauge just scraped through by one vote.

*** With muct richer and much older languages than Hindi, language like Tamil and Bengali, we will never be able to have a national language. And because of that, all we did with great difficulty was to say that Hindi would be the official language, meaning clearly that it may be used only for official and certain other limited purposes." (The Review, December 1967 - January 1968, p. 39).

According to Dr. Ambedkar, Hindi was voted the "national language". While according to Mr. Anthony, it was voted as the "official" language, as, in his opinion, there could be no "national" language. Both agreed that Hindi won by a single vote, but did not say against which language. (1)

---

(1) P.Kodanda Rao: Language issue in the Indian constituent Assembly (1946-1950) - Rational Support for English and Non - Rational support for Hind. The International Book House Private Ltd. 1969 Chapter 1 page 4-5.

امیر خسرو کی ہندوی شاعری کے بارے میں اور ان کی ہندوی شاعری پر طریق تحقیق اور نتائج اخذ کرنے کے بارے میں گیان چند جین نے جو لکھا ہے، اس سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ ماخذ کی کمی یا عدم دستیابی کی وجہ سے جب ہم حقائق کو دریافت کرتے ہیں تو کچھ خارجی اور کچھ داخلی ذرائع پر بھی نظر دوڑانی پڑتی ہے۔ خسرو کی شاعری کی جو لفظیات ہے، اس میں کے چند ہندی لفظ خسرو کی فارسی شاعری میں بھی ہیں۔ ان کے داخلی شواہد کی بنا پر نہ انکار کی گنجائش نکلتی ہے نہ پوری طرح اقرار کی۔ پھر جو قریب تر ماخذ ہیں ان پر بھروسہ نہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ ادب میں زبانی روایت بھی ہوتی ہے۔ یہ زبانی روایت (Oral tradition) تحقیق کا ایک نیا زاویہ نظر ہے اور اس کی اپنی معنویت ہے، قاضی عبدالودود اور رشید حسن خان اس تعلق سے سخت گیر تھے۔ زبان و ادب کی تحقیق فارمولا بند تحقیق نہیں ہوتی، سو فیصد نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ آپ صرف حقائق سے قریب تر جاتے ہیں، آخر تک نہیں پہنچ سکتے۔ محمد حسین آزاد کی تحقیقات کو قاضی صاحب نے رد کیا، مگر قدرت اللہ قاسم کی "مجموعہ نغز" کی دریافت کے بعد "آب حیات" کے بہت سے واقعات کا ماخذ مجموعہ نغز ہی ٹھہرا۔ ادبی تحقیق میں خصوصاً حرف آخر کوئی چیز نہیں۔ گپیں ہانکنے کی بھی روایت ہے۔ سومنات کے واقعہ کو خصوصاً ہندوؤں میں صد فیصد صحیح سمجھا جاتا ہے۔ اکثر مسلمان بھی اسی سنی سنائی بات پر صاد کرتے ہیں، جین صاحب بھی اسی کو سچ مانتے ہوں گے۔ مگر مشہور مورخ پروفیسر رومیلا تھاپر نے اس واقعہ کی افسانوی حقیقت واضح کردی۔

رومیلا تھاپر نے لکھا ہے کہ سومنات کے مندر کی مسماری شیو اور جین راجاؤں کے درمیان مال و متاع کے لیے جنگوں کا نتیجہ ہے۔ محمود غزنوی کے محل کے باہر کا دروازہ بھی سومنات کا دروازہ نہیں ہے۔ وہ دروازہ مصر میں بنا ہوا ہے۔ شیو اور جینیوں کی جنگ کا کوئی ذکر نہیں، سارا الزام محمود غزنوی پر ہے۔

وہ الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

سومنات کی دولت پر شیو راجا بھی قابض ہونا چاہتے تھے اور وقتاً فوقتاً دیگر حکمران بھی، محمود غزنوی ان میں سے ایک ہے۔ اگر مندر لوٹا گیا تو لوگا بے بگا ہے اس میں ہندو بھی شامل تھے۔ یہ مذہبی تعصب نہیں تھا۔ بلکہ دولت حاصل کرنا اس سارے قضیہ کی بنیاد ہے۔ رومیلا تھاپر نے سومنات کے حوالے سے تاریخ کے یکے بعد دیگرے اوراق پلٹے ہیں اور اس نیم تاریخی افسانے کو دلچسپ انداز سے پیش کیا ہے (1) بقول رومیلا تھاپر:

- The eleventh Century Jaina Poet from the Parawara Court in Malwa, Dhanpala, a Contemporary of Mahmud, briefly mentions Mahmuds campaign in Gujarat and his raid on various place including Somanatha. He comments however, at much greater length on Mahmud's inability to damage the icons of Mahavira in Jaina temples for, as he puts it, Snakes cannot swallow Garuda nor can stars dim the light of the sun. This for him is proof of the superior power of the Jaina images as compared to Saiva, the later having been descecrated." (2)

(1) Romila Thapar: Narratives and the Making of History: DUP. New Delhi 2000 Pages 20-50.

(2) Romila Thapar: Narratives and the Making of History: DUP. 2000 Pages 33-34.

امیر خسرو کی ہندوی شاعری کی طرح قدیم دکنی اردو کے حوالوں سے جو ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیقات ہیں گیان چند صاحب کا تحقیقی رویہ (approach) صحیح ہے۔ بعض اوقات کم معتبر ذرائع کارآمد ثابت ہوتے ہیں اور ان کو مخصوص تاریخی سیاق میں دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے مسائل سے صرف اردو ہی کے محقق دو چار نہیں ہوئے ساری زبانوں میں تحقیق کی یہی صورت حال ہے۔ میں نے اپنی کتاب میں بھرتری ہری سے منسوب شاعری کے بارے میں مفصل بحث کی ہے کہ وہ اشلوک بھرتری ہری کے ہیں یا کسی اور کے بھرتری ہری ہے بھی یا نہیں۔ لیکن ہاں تاریخ میں قدیم سے بھرتری ہری اور اس کے کلام کا ذکر ملتا ہے۔ اہل ہند ہی نہیں اہل یورپ بھرتری ہری کی جمالیات اور اس کے سیاسی فلسفہ اخلاق و نیز رہبانیات سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں(۱) میرے اس نقطہ نظر کو میرے مطالعہ کے دوران کہیں نہ کہیں سے مجھے یہ روشنی ملی ہے۔ ممکن ہے بزرگوں سے گفتگو نے یہ راستہ سجھایا ہو، یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ گیان چند نے البتہ امرت رائے کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے، مگر یہ ایک بنیادی طور سے گمراہ کن کتاب ہے یعنی A House Devided۔ گوپی چند نارنگ کے بھی اپنے دلائل ہیں جن کی بنیاد پر امیر خسرو کی ہندوی شاعری کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے تحقیقی مجلہ "ہندوستانی زبان" میں بھی میں نے امیر خسرو کی ہندوی شاعری کا شمالی ہندوستان کے لسانی منظر نامہ میں جائزہ لیا تھا اور اسی نتیجہ پر پہنچا تھا جو گوپی چند نارنگ کا مطمح نظر تھا۔(۲)

---

(۱) اقبال کا ایک ممدوح: بھرتری ہری، بمبئی۔۲۰۰۲ء

(۲) مطبوعہ ہندوستانی زبان (امیر خسرو نمبر) مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری۔ یہ مضمون میری کتاب "اردو زبان اور سماجی سیاق" میں بھی شامل ہے۔

گیان چند جین نے البتہ کئی لحاظ سے تحقیق نظریہ سازی میں ڈاکٹر گیان چند نارنگ کے مقابلے میں امرت رائے کو فوقیت دی ہے۔ میں اس کے بعد آنے والی بحثوں سے صرف نظر کرتا ہوں کہ یہ موضوعات عام طور پر خسرو شناسی کی ذیل میں زیر بحث آچکے ہیں۔ مجھے بہر طور امرت رائے نہیں ڈاکٹر نارنگ کے مفروضات اور تحقیق استنباط قابل قبول معلوم ہوتے ہیں، جس میں انہوں نے بقول گیان چند جین "ڈاکٹر وحید مرزا کے رویے کو نشان راہ بنایا ہے، امرت رائے کی یہ رائے بہت اہم ہے کہ

"اگر گورکھ ناتھ کے کلام کو اس بنا پر رد کیا جائے کہ اس کی پوری زبان مستند نہیں تو کبیر اور میرا بائی کے کلام کو اسی دلیل سے کیوں نہ رد کیا جائے" (امرت رائے ص ۸۳ بحوالہ ایک بھاشا: .... از گیان چند ص ۵۳)

لیکن یہاں گورکھ ناتھ کے کلام کی زبان بھی ایک سوالیہ نشان ہی ہے، جو مزید غور و خوض اور مطالعہ چاہتی ہے۔ جہاں تک کبیر کی زبان کا تعلق ہے، اس میں کھڑی بولی اردو و ہندی کے چند نمونے ضرور ہیں، باقی سب برج ہے، اسی طرح عظیم شاعرہ میرا بائی بھی اصلاً راجستھانی کی شاعر ہیں، برج اور راجستھانی کی اپنی اپنی آزادانہ شناخت ہے، ان کو ہندی کے دائرہ کار میں لانا لسانی توسیع پسندی کا آمرانہ رویہ ہے۔

جہاں تک خسرو کے ہندوی کلام کا تعلق ہے قیاس کہتا ہے کہ یہ خسرو کی فنکاری کے نمونے ہیں، تاہم میں اس بات پر اصرار نہیں کرتا اور جو لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں، میں ان کی باتوں کو بھی پورے احترام کے ساتھ ذہن میں محفوظ رکھتا ہوں اس وقت تک جب تک کسی ماخذ کے ذریعے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ خسرو کی شاعری کے نمونے نہیں ہیں۔

☆......☆......☆

تیسرا باب

اردو اور ہندی پر ایک نظر

اردو اور ہندی، ہند آریائی خاندان کی زبانیں ہیں۔ یہ کھڑی بولی سے ارتقاء پذیر ہوئیں۔ لیکن کھڑی بولی کی ابھی کلی طور پر وضاحت نہیں ہو سکی ہے۔ اسے صرف اردو کا تشکیلی دور کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی قدیم زبانوں کے بارے میں ماہرین نے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہند آریائی کے ارتقاء میں ویدک سنسکرت، پالی، پراکرت اور اپ بھرنشاؤں کی چار منزلوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اردو کے سکالر بھی تاریخی لسانیات کے ماہرین ہی کا تتبع کرتے ہیں، عام طور سے وہ سنسکرت اور پراکرتوں کا کافی وشافی علم نہیں رکھتے، یہ ایک حقیقت ہے، لہٰذا تاریخی لسانیات کے ماہرین جیسے پول بلاک، جیمز جارج گریرسن اور سنیتی کمار چٹرجی جیسے ماہرین ہی سے وہ استفادہ کرتے ہیں۔ البتہ پالی، پراکرات اور اپ بھرنشاؤں کو جنہیں ہم ویدک سنسکرت کے بعد کی منزلیں سمجھتے آئے ہیں، کاکا کالیکر (۱) کے مطابق یہ پراکرتیں اور بھرنشائیں سنسکرت سے پہلے اپنا وجود رکھتی تھیں، جو ظاہر ہے عوامی زبانیں رہی ہوں گی اور ان کے بطن سے ایک مہذب زبان سنسکرت ڈھالی گئی اور زبان کو "قواعد بند" کیا گیا، اس کے لیے اصول وضوابط متعین کیے گئے اور اسے ریاضی کی سی قطعیت دی گئی۔ اس طرح تاریخی لسانیات کے یہ مفروضات عام قاری کے لیے اب بھی لاینحل ہیں۔

(1) Kaka Saheb Kalekar: The Link of Sanskrit ---- in Affinity of Indian Languages: The Publication Division Publication - Delhi - 1959 Page.31

جہاں تک کھڑی بولی کا تعلق ہے یہ اپ بھرنشاؤں سے پیدا شدہ ایسا لسانی ہیولیٰ ہے جو برج بھاشا کے عروج کے زمانے میں ایک لسانی صورت پیدا کر رہا تھا۔ اور اسی سے ایک عام رابطہ کی زبان "ہندوستانی" نے جنم لیا۔ جو مغلیہ عہد میں آہستہ خرامی کے ساتھ پروبال نکال رہی تھی اور جس نے سترہویں صدی میں ایک واضح شکل اختیار کی۔ اسی ہندوستانی نے جب بول چال یا تقریر کی سرحدوں کو پار کیا اور میدان ادب میں داخل ہوئی تو اس کی پہلی شکل "اردو" کی صورت میں نمودار ہوئی۔ ابتدائی یا تشکیلی دور میں اسے ہندی، ہندوی، ریختہ، زبان اردوئے معلیٰ، اردو اور پھر ہندوستانی کہا گیا۔ "ہندی" عربوں کا دیا ہوا نام ہے۔ اس کے معنی ابتدا میں عرب عام طور پر "ہندوستانی زبانیں" مراد لیتے تھے۔ اگر ہم کاکا صاحب کے مذکورہ نظریے کو نہ بھی مانیں، تو کھڑی بولی کوئی قبل از اردو لسانی ہیولیٰ (Proto-Urdu) رہی ہوگی، جس میں سے پہلے بول چال کی ہندوستانی وجود میں آئی ہوگی اور اسی سے ادبی زبان نکھر کر سامنے آئی جس کے مترادفات کے طور پر ہندی، ہندوی، ریختہ، اردوئے معلیٰ اردو کے ناموں نے جنم لیا۔ اردو ہندی کا استناد مترادفات کے طور پر غالبؔ کی اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں موجود ہے۔ جس زبان کو ہم آج اردو کہتے ہیں، ایک زمانہ میں اسے ایک ساتھ "ہندی۔ اردو" کے نام سے بھی یاد کیا گیا، جس سے "اردو۔ ہندی" کے مترادفات ہونے کو مزید تقویت ملتی ہے۔

رستم علی بجنوری کی کتاب "قصہ و احوال روہیلہ" کا شمار شمالی ہند میں اردو نثر کی چند اولین کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب ۱۷۷۶ء میں تصنیف ہوئی، اس کتاب سے روہیل کھنڈ میں اشراف میں بولی جانے والی اردو کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے مذہبی رجحانات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہاں بطور خاص اس بات کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے کہ مولف رستم علی نے اپنی زبان کو "ہندی اردو" کہا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں یہ زبان "ہندی" یا صرف "اردو" کے بجائے، "ہندی۔ اردو" بھی

کہلاتی تھی۔ بعد میں ایک ہی زبان کے دو الگ الگ نام کی حیثیت سے بھی رائج ہوئے۔ اردو یا ہندی کی طرح "اردو ہندی" مرکب نام سے بھی اردو پہچانی جاتی تھی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے لیے مترادفات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رستم علی بجنوری کا یہ قصہ "اردو رسم الخط" ہی میں لکھا گیا ہے اور یہ آج کی اردو ہی کا نمونہ ہے، آج کی ہندی کا نہیں۔ (۱)

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو سنسکرت سے جنمی ہے اور وہ عربی فارسی اثرات کے باوجود ایک خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس کے صوتیات فارسی عربی آمیز سنسکرت یا ہندوستانی صوتیات (Indian Phonetics) ہے جس پر اب انگریزی کے اثرات بھی ہیں۔ اس کی صرف اصلاً ہندوستانی ہونے کے باوجود عربی اور فارسی کے زیر اثر ہے اور نحو خالص ہندوستانی ہے۔ اردو میں عربی اور فارسی کا ذخیرہ الفاظ دیگر ہندوستانی زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

عربی فارسی کی صوتی خصوصیات کی وجہ سے اردو کا صوتی نظام دیگر ہندوستانی زبانوں کے صوتی نظام کے مقابلہ میں وسیع تر ہے، جس کی وجہ سے اردو سے واقف کوئی بھی شخص روسی، جرمن وغیرہ دیگر زبانوں کے حصول میں (صوتی لحاظ سے) سہولت محسوس کرتا ہے اور عربی۔ فارسی صرفی خصوصیات کی وجہ سے اردو میں اظہار کی قوت بڑھ گئی ہے۔ اردو میں قوت اظہار (Expressiveness) اور اختصار (Precision یا Brevity) کی لسانیاتی خصوصیات کا سرچشمہ یہی صرفی خصوصیات ہیں۔ اس سے اردو زبان ہندی کے مقابلے میں ممیز ہو جاتی ہے۔ زبان میں شگفتگی اور شعریت کی فراوانی عربی فارسی صوتیات اور ذخیرہ الفاظ سے آئی ہے۔ اردو کی شعری اسلوبیات اور نثری آہنگ کی خوشنمائی کی وجہ سے یہی لسانی خصوصیات ہیں۔

---

(۱) قصہ و احوال روہیلہ از رستم علی بجنوری کو ممتاز مورخ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی نے مرتب کر کے طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کتاب پر اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی مقدمہ ہے۔ (مطبوعہ، منوہر، دلی، ۲۰۰۵، ص ۱۳)

ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب کے تیسرے باب میں پاکستانی اردو سکالر ڈاکٹر سہیل بخاری کے حوالے دیے ہیں۔ میں کھڑی بولی کے بارے میں ماقبل السطور میں اظہار خیال کر چکا ہوں: ڈاکٹر سہیل بخاری کے درج ذیل بیانات کہ:

ا۔ "اردو زبان کی عمر کچھ نہیں تو کم از کم چند ہزار سال تو ضرور مانی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے الفاظ اس برصغیر کی قدیم ترین کتاب رگ وید میں بھی ملتے ہیں۔"

۲۔ "رگ وید میں جن شاعروں کے بھجن ملتے ہیں ان میں کچھ ایسے شاعر بھی تھے جو اردو کے دیس میں بستے تھے یا اردو بول سکتے تھے، کیونکہ انہوں نے اپنے بھجنوں میں آریائی بولوں کے ساتھ ساتھ اردو کے بول بھی باندھے ہیں۔"

(گیان چند۔ بحوالہ کوزی، نقوش شمارہ ۱۰۶، جنوری تا دسمبر ۱۹۶۶ص ۱۳۸) واردو کی کہانی، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۷۵ء)

مجھے شک ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری کی نظر سے رگ وید نہیں گزرے ہوں گے۔ یہ تو صرف چند سنسکرت داں مہا پنڈتوں ہی کے مطالعہ میں رہے ہوں گے۔ ممکن ہے عبدالرحمن بجنوری کی نظر سے گزرے ہوں جنہوں نے جرمنی میں تعلیم حاصل کی تھی جو سنسکرت مطالعات کا مرکز رہا ہے اور جنہوں نے لکھا تھا کہ:

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوان غالبؔ"

ڈاکٹر سہیل بخاری کے اردو کے تعلق سے مذکورہ بیانات نہ صرف یہ کہ مبالغہ آمیز ہیں بلکہ فنطاسیہ (Fontassy) سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ بجنوری کا مذکورہ قول آریاؤں کی عظیم مذہبی کتاب کی عظمت کا اردو کے ایک جید عالم کا اعتراف ہے۔ اس طرح کے اعترافات کی اردو میں کمی نہیں ہے۔

میری ناقص رائے میں اردو کی عمر بشمول قبل از اردو (Proto - Urdu) کے ۷۰۰ سال سے آگے نہیں بڑھتی۔ ہندوستانی زبانوں کا غالباً اولین بیان امیر خسرو (نہ سپہر) ہی کا ہے جنہوں نے زبان دہلی اور اردوئے معلیٰ کا ذکر کیا ہے اور دیگر ہندوستانی

زبانوں کا بھی۔ امیر خسرو کا زمانہ (۱۳۲۵۔۱۲۵۳) کا ہے۔

گیان چند جین نے الفاظ کی تاریخ جاننے کے سلسلے میں ہندی، اپ بھرنش، پراکرت، پالی اور سنسکرت وغیرہ سے رجوع کرنے اور اصل تک پہنچنے کی بات کی ہے۔ لسانیات میں یہ ایک الگ میدان ہے جسے اشتقاقیات (Science of Etymology) کہتے ہیں۔ گیان چند کا خیال ہے کہ اہل ہندی اس سے مانوس ہیں وہ الفاظ کی کھوج لگا سکتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے ہندی پریم میں یہ بھول گئے کہ یہ ہندی والوں کے آسانی سے بس میں آنے والا علم نہیں ہے، جب تک سنسکرت کی شدبد نہ ہو یہ ایک مشکل کام ہے، اگر ہندی والوں کے لیے یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو اشتقاقیات (Etymological Studies) کی کیا ضرورت تھی، لفظوں کی تاریخ کی کھوج خود ایک سائنس ہے۔ اردو ہندی میں فارسی عربی الفاظ بھی ایک بڑی تعداد میں مستعمل ہیں،، تو کیا ہر اردو والا ان الفاظ کی جڑ تک پہنچ سکتا ہے؟ نہیں! اس کے لیے عربی فارسی زبان کی بنیادی معلومات کے ساتھ صوتیات، گرامر اور لفظوں کی گردان اور معنیات (Semanties) وغیرہ سے بھی دلچسپی ہونی چاہیے جو موجودہ نظام تعلیم میں کم سے کمتر ہوتی جارہی ہے۔ ہندی والے نہ سنسکرت کی مبادیات سے واقف ہیں نہ اردو والے عربی فارسی کی مبادیات سے، پھر ایک لسانی رجحان کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر نہ ہندی والوں میں موجود ہے نہ اردو والوں میں۔ جہاں تک اردو والوں کے اصل سے ناتا توڑنے کا سوال ہے وہ دنوں طرف برابر ہے۔ کیا ہندی سے ارادتاً منظم طریقے سے عربی فارسی کے الفاظ خارج کرنے کا رجحان نہیں تھا؟ یہ رجحان آج بھی موجود ہے لیکن بادی النظر میں عربی فارسی کے الفاظ جو زبان کا جز بن گئے ہیں ان کو نکالنا ناممکن ہو گیا ہے، کیا ہندی والے ان کی اصل سے واقف ہیں۔ ان کا جو جائز رشتہ عربی فارسی سے ہے (اگرچہ بیشتر حالات میں یہ رشتہ اردو کے ذریعہ قائم ہوا ہے) ہندی والے اس سے اپنا ناتا توڑ بیٹھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ زبان کی لسانی نزاکتوں سے نہ وہ واقف ہیں، نہ زبان سے وہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ رونا ایک طرفہ نہیں دو طرفہ ہے۔

ہندی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تقریباً ہر زبان فارسی، عربی سے متاثر ہے اور ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ جو الفاظ ہم استعمال کر رہے ہیں ان کی اصل کیا ہے؟ عام آدمی کے لیے اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اسے تو ''لفظ'' کو خواہ وہ کسی زبان کا ہو ''لفظ'' کی حیثیت سے استعمال کرنا چاہیے، نہ کہ سنسکرت، عربی یا فارسی کی اصل معلوم کر کے اسے نکال باہر کرنا چاہیے جو عام طور پر ہندی والوں کا رویہ ہے۔ اردو خدا کا شکر ہے کہ اس ضمن میں فراخ دل واقع ہوئی ہے، ناسخ اور حاتم کے زمانے میں اصلاح پسندی کا یہ مرض چاہے انہیں لاحق ہو گیا ہو لیکن بعد میں جس وسعت نظری سے اردو والوں نے کام لیا اس سے ان کی زبان مالا مال ہوئی۔ انگریزی کے بیشمار الفاظ آج اردو میں جس طرح استعمال ہو رہے ہیں اس طرح ہندی میں نہیں ہو رہے ہیں۔ جامعہ، ماضی کی یادگار ہے آج یونیورسٹی، کالج، پرنسپل، پروفیسر، لیکچرر، اسسٹنٹ لیکچرر، سکول، ٹیبل، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹی وی، بے شمار انگریزی کے الفاظ اردو کا جز ہیں اور اردو کی طاقت بھی۔ ہندی کے نعم البدل الفاظ لوگوں کو معلوم نہیں، یہاں اس فہرست سازی کی ضرورت نہیں ہے۔ زبان میں خالصیت پسندی (Purism) کا اردو میں اب رجحان نہیں ہے جو ہندی کا ایک عام مزاج بن گیا ہے۔ یہاں پر دو ایک واقعات بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

یونیورسٹی کی ایک انٹرویو کمیٹی میں وائس چانسلر کے ساتھ جو اردو سے ناواقف تھے، زبانوں کے لین دین کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ مراٹھی پر عربی اور فارسی کے اثرات ہیں تو انہیں تعجب ہوا، گویا میں کوئی نئی بات کر رہا تھا۔ کہنے لگے کوئی مثال دیجئے! میں نے کہا کہ ہم مراٹھی میں ''اکل'' کہتے ہیں وہ عربی کا لفظ ''عقل'' ہے، کہا کہ آج تک یہ بات میری اکل (عقل) میں نہیں تھی، کہا کچھ اور مثالیں دیجئے، میں نے ایک ہی سانس میں دس بارہ لفظ گنائے جو عربی فارسی کے ہیں اور مراٹھی کا روزمرہ ہیں۔ وائس چانسلر صاحب بہت خوش ہوئے اور زبانوں کے مطالعوں کی اہمیت ان پر

واضح... ؟

بال گنگا دھر تلک کے زمانے میں مراٹھی سے عربی، فارسی الفاظ نکالنے اور ان کی جگہ سنسکرت الفاظ استعمال کرنے کی ایک تحریک شروع ہوئی۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ اس منفی تحریک سے مراٹھی کی روح اور طاقت کمزور ہو رہی ہے، لہٰذا پھر یہ تحریک روک دی گئی۔ مراٹھی کے قدیم ادب میں ''بکھر'' نام کا ادب بھی شامل ہے۔ یہ وقائع نویسی ہے، بکھر، ''خبر'' کی تقلیب ہے۔ یہ صنف ادب نیم فارسی ہے۔ اگر مراٹھی داں حضرات کو بکھر ادب کا مطالعہ کرنا ہو تو فارسی سے واقفیت ضروری ہے۔ صرف اردو والوں کی تضحیک اور تمسخر اڑانے سے کسی کی انا اور لسانی تعصب کو سکون اور شانتی ملتی ہو تو ملتی ہو، اس پر جملہ بازی کرنے کی بجائے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

ہندی والے دکنی کو (جو دراصل اردو ہے) اب ''دکنی ہندی'' کہہ کر پکارتے ہیں بلکہ اس پر ناجائز طریقے سے قابض ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن جب تک فارسی عربی کے لسانی، تہذیبی اور ادبی پس منظر سے وہ واقف نہ ہوں تب تک وہ نہ لفظوں کی اصل تک پہنچ سکتے ہیں، نہ ادب سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ تلمیحات اور اشارے کنایے سمجھ سکتے ہیں۔ دکنی پر مراٹھی کے گہرے اثرات ہیں۔ مراٹھی کی کثیر لفظیات سنسکرت الاصل ہے لیکن اس کے باوجود ہندی داں حضرات ان کی اصل تک نہیں پہنچ سکتے، یہاں ہندی والوں کی مانوسیت جس کا ذکر جین صاحب نے کیا ہے ڈھ جاتی ہے۔

''دکنی اردو'' پر دکنی بنام ہندی کئی سکالروں نے ناقص کام کیا ہے۔ اکثر دکنی اردو کے مخطوطے جو عربی فارسی رسم الخط میں ہیں پڑھ نہیں سکتے (بلکہ اردو رسم الخط سے کلی طور پر نابلد ہیں)، مگر دکنی اردو کے سکالر بن گئے ہیں۔ یہ ''دکنی ہندی'' کے لیے ایک بہت بڑا دھوکہ ہے Its a Fraudulent activity ہے۔ ایک صاحب جو عثمانیہ یونیورسٹی میں ہندی کے لیکچرر تھے، ''دکنی ہندی'' پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھ رہے تھے، وہ پنچ مڑھی (مدھیہ پردیش) میں منعقدہ سرمائی لسانیات کے سکول میں میرے ساتھ شریک تھے، جب انہیں معلوم ہوا کہ میں اردو کا طالب علم ہوں اور دکنی اردو سے دلچسپی رکھتا ہوں تو

مجھ سے کہا کہ میں ان کے کام میں مدد کروں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا موضوع کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ "دکنی ہندی کا پربندھ کاویہ"۔ میں نے کہا دکنی کی مختلف مثنویوں پر اردو میں کام ہو چکا ہے اور وہ چھپ چکی ہیں، کہنے لگے لیکن میں تو ہندی میں کام کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کیا آپ اردو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔ کہا نہیں! میں نے کہا کہ پھر یہ کام آپ کس طرح کریں گے، مخطوطات سارے اردو رسم الخط میں ہیں۔ کہنے لگے ایک مولوی صاحب میرے پاس آتے ہیں ان سے دکنی مثنویوں کی قرأت کرالیتا ہوں اور میں ناگری میں لکھ لیتا ہوں، اور جو الفاظ میں سمجھ نہیں پاتا وہ مولوی صاحب سمجھا دیتے ہیں۔ دکنی کے نام پر ہندی تحقیق کا یہ حال ہے۔

ممبئی میں دیوی سنگھ چوہان صاحب دکنی ہندی سے بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ پہلے وزیر تھے، پھر مہاراشٹرا پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہو گئے تھے، اردو سے تھوڑی سی واقفیت بھی تھی۔ انہوں نے پروفیسر مسعود حسین خان کے مرتبہ "ابراہیم نامہ" کو ہندی میں مرتب کیا۔ اسی طرح گلشن عشق اور علی نامہ کو جو ملا نصرتی کی شہکار دکنی اردو مثنویاں ہیں اور تاریخ سکندری کو بھی دیوناگری میں منتقل کیا اور عبدالحق کی کتاب "نصرتی" سے سارا مواد لے کر مقدمہ بھی لکھا۔ اپنی دکنی دانی پر ناز تھا، دوسروں کا امتحان لینے کے بہت شوقین تھے، میرے بھی امتحان لینے کی اکثر کوشش کرتے تھے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ چوہان صاحب آپ مجھے بتایئے کہ آپ نے جو دکنی شہپارے دیوناگری میں مرتب کیے ہیں تو کیا آپ نے قلمی کتابیں دیکھی ہیں؟ پتہ چلا کہ وہ مخطوطہ پڑھنے کی صلاحیت سے محروم تھے اور عبدالقادر سروری وغیرہ کی مرتبہ مطبوعہ کتابوں سے انہیں ناگری میں منتقل کیا کرتے تھے، (۱) کیا یہ عبرت کا مقام نہیں ہے۔ الفاظ کی اصل بیان کرتے ہوئے اردو ماہرین دکنیات پر خوب اعتراضات کرتے تھے کہ انہیں لفظوں کا گیان نہیں اور انہوں نے الفاظ کے معنی (قدیم سنسکرت الاصل الفاظ کے) غلط دیئے ہیں۔ دکنی اردو

(۱) دیوی سنگھ چوہان کے کئی مضامین "نوائے ادب" (بمبئی) میں شائع ہوئے ہیں۔

ماہرین چونکہ عام طور پر سنسکرت اور پراکرتوں سے واقف نہیں ہوتے اس لیے اس طرح کی غلطیاں ان سے یقیناً سرزد ہوئی ہیں، لیکن طرفہ تماشہ یہ کہ چوہان صاحب عربی اور فارسی کے صحیح الفاظ کو بھی سنسکرت بتاتے تھے۔ ایک واقعہ یاد ہے۔ انہوں نے ملا نشاطی کی ''پھول بن'' ہندی میں مرتب کی ہے۔ عبدالقادر سروری صاحب نے جن الفاظ کے صحیح معنی دیے ہیں۔ مثلاً ''رب'' (خدا) چوہان صاحب نے اپنی سنسکرت نوازی کے شوق میں اس کی اصل بتائی کہ ''رب'' اصل میں سنسکرت کا لفظ ہے، ''روی'' سے مشتق ہے۔ سنسکرت میں ''روی'' کہتے ہیں سورج کو اور سورج کی پوجا ہوتی ہے، یہی ''روی'' عربی میں رب ہوگیا ہے، میں نے کہا کہ عربی میں رب کے معنی پالنے والے کے ہیں، لیکن چوہان صاحب ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ''پھول بن'' میں لمعات عراقی کا حوالہ ہے، انہوں نے ''لمعات'' (کرنیں) کے لیے لکھا کہ عبدالقادر سروری صاحب اس لفظ کو نہیں سمجھ سکے۔ یہ لفظ لمحہ ہے اور لمحہ کے معنی ہیں ''چھن''۔ عراقی شاعر کے بارے میں لکھا کہ عراق مدینہ کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے۔ دیوی سنگھ چوہان کو ہر لفظ سنسکرت سے ماخوذ دکھائی دیتا ہے۔ ایک آخری مثال۔ ''پھول بن'' میں ایک لفظ ''منبت کاری'' آسان اردو لفظ ہے، سنسکرت پریم میں چوہان صاحب نے لکھا ہے کہ یہ لفظ اصل میں مراٹھی کا لفظ ہے۔ مراٹھی میں ''موم بتی'' کو ''مین بتی'' کہتے ہیں اور ''کاری'' بمعنی ''نکالی''، یعنی موم بتی نکالی۔ یہ اب دیکھیے ہندی والوں کی سنسکرت اور پراکرت سے مانوسیت اور اشتقاقیات میں مہارت...... کاش گیان چند جین اردو والوں پر جملہ بازی کرنے سے قبل مذکورہ حقائق سے بھی واقفیت حاصل کرتے۔ گیان چند جین کی یہ متعصبانہ رائے زنی ہے، علمی نہیں۔

اب آیئے دوسرے نکتے کی طرف۔ گیان چند لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی دوسری ہند آریائی زبانوں میں مثلاً گجراتی، مراٹھی، بنگالی، آسامی، پنجابی وغیرہ کا ماضی کا سفر کم و بیش ایک شاہ راہ پر چلتا ہے، لیکن اردو کا نہیں۔ اس میں

ہندوستان سے زیادہ عرب وعجم کا رنگ ہے۔ سوئے اتفاق سے اس لے پالک کا فرضی جد عربی، اس کے صلبی جد سنسکرت سے علیحدگی اور آویزش پر عمل کرتا ہے۔ عربی نسل مذہب اور ثقافت کے معاملے میں خود کو سب سے اوپر جان کر دوسروں سے علیحدگی کو اپنی حکمت عملی کا حصہ جانتی ہے۔"

ا۔ ہندوستان کی زبانوں کے ایک شاہراہ پر چلنے کا ذکر صحیح ہے، یہ زبانیں محدود علاقوں میں کٹی ہوئی زبانیں ہیں، اردو اور ہندی کی طرح بڑی زبانیں نہیں ہیں۔ اعلیٰ ادب کی پروردہ ہیں، لیکن ان کا دائرہ محدود ہے لہٰذا ان کے لیے ایک ہی شاہراہ متعین ہوگئی۔ اردو ایک رابطہ کی زبان Lingua Franca کے طور پر ابھری جو تاریخی وجوہات کی وجہ سے عربی فارسی سے بھی جڑ گئی۔ اس تعلق نے رابطہ کی حیثیت سے اس میں وسعت، طاقت اور توانائی پیدا کی۔ اردو نے بھی اسی شاہ راہ کو اپنایا جو ساری زبانوں کی بنیاد ہے، لیکن اپنی کھڑکیاں کھلی رکھیں تاکہ حسب ضرورت اطراف واکناف سے بھی رشتے اور رابطہ برقرار رہیں اور زبان آس پڑوس کی پھلواریوں سے بھی لطف اندوز ہو۔ اردو زبان ایک باغ کی طرح ہے جو رنگ برنگ کے پھولوں سے آراستہ ہے۔ اس میں چمپا، چنبیلی بھی ہے، لالہ وگل بھی ہیں، سوسن وگلاب بھی ہیں، گیندے کے پھول بھی ہیں اور یہ سارے پھول اور پودے اپنی ایک ہی دھرتی ہندوستان جنت نشان میں پیوست ہیں۔ اردو جو سنسکرت کی بیٹی ہے اس نے اجنبیوں کو اپنا بنالیا اور دوری کو قرب میں تبدیل کردیا۔ جین صاحب یہ تو ضرور جانتے ہوں گے کہ کوئی زبان اور کوئی تہذیب خالص (pure) نہیں ہوتی۔ پاس پڑوس کی زبانوں اور تہذیبوں کو متاثر کرتی بھی ہے اور متاثر ہوتی بھی ہے۔ یہی اردو جب جنوب میں پہنچتی ہے تو مراٹھی کے اثرات بھی قبول کرتی ہے (دکنی اردو کی حد تک)۔ انگریز آئے تو ان سے بھی دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور انگریزی کے الفاظ، اصوات اور طرز فکر سے بھی مطابقت پیدا کرتی ہے۔

۲۔ اردو پر لسانی اور تہذیبی اعتبار سے عرب وعجم کا نہیں ہندوستانی تہذیب کا اثر

زیادہ نمایاں ہے اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ ہندوستان کی بیشتر زبانیں ہندو تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں، اپنے اپنے علاقوں میں بند ہیں، لیکن اردو زبان و ادب ملی جلی، مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی علامت ہے، جس میں ہندو فلسفہ وفکر بھی ہے، سنسکرت زبان و ادب کی اعلیٰ اقدار بھی ہیں۔ وطن عزیز کی مٹی کی خوشبو بھی ہے، اجنتا ایلورہ کے غار بھی ہیں، کھجراہو اور کونارک بھی ہیں، رام، لکشمن اور کرشن بھی ہیں، مہاتما گوتم بدھ، مہاویر جین بھی ہیں اور گرونانک بھی ہیں۔ رامائن اور مہا بھارت اور پران بھی ہیں، گنگا، جمنا کے مقدس مناظر بھی ہیں اور ان میں حمد و نعت و منقبت، اسلامی فلسفہ وفکر، غار حرا، گنبد خضرا، قطب مینار اور تاج محل اور بی بی کا مقبرہ بھی ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کی عکاسی جو اردو ادب میں ہوتی ہے، اس کے تخلیق کار ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ جاں نثار اختر کی مرتبہ "ہندوستان ہمارا" دیکھیے اور دیکھیے ہندوستان اس میں کیسے سانسیں لے رہا ہے۔ اردو نے اپنے صلبی جد سے کبھی علیحدگی اختیار نہیں کی۔

۳۔ عربی نسل نے کبھی مذہب اور ثقافت کے معاملہ میں برتری کا دعویٰ نہیں کیا، ہاں عرب و عجم کی جو بات ہے وہ مخصوص سیاق میں ہے۔ اسلام کے طلوع ہونے کے بعد مساوات، بھائی چارہ، رواداری کا پیغام سارے عالم کو عربوں نے دیا۔ خانہ کعبہ میں جو حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریم کی تصاویر تھیں انہیں بھی انہوں نے محفوظ رکھا۔ رسول عربی کا آخری خطبہ گیان چند صاحب کی نظر سے نہیں گزرا، اس میں کہا گیا ہے کہ عرب و عجم میں، کالے اور گورے میں کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہے، اسلام کا یہ میکنا کارٹا ہے۔ جین صاحب کا آریوں کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ کیا ان میں نسلی فخر نہیں تھا۔ کیا آج برہمنوں میں اعلیٰ ذات کا نشہ اور فخر نہیں ہے۔ کبھی کبھی عرب بھی اس نشہ میں چور رہے، مگر وہ قدیم نسلی غرور ہو سکتا ہے جو اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔ عرب مسلمانوں نے اس فخر و غرور کے نشے کو کبھی پسند نہیں کیا۔

اگر عرب ویسے ہی تھے جیسا کہ گیان چند پیش کرتے ہیں تو کیا وجہ تھی کہ انہوں

نے ہندوستانی علم کو سراہا، اس سے استفادہ کیا اور دنیا بھر میں پھیلایا۔ بہت ساری سنسکرت کی کتابوں کے عربی میں ترجمے کیے، ہندوستان کے علم و ہنر کی ترویج و اشاعت کی۔ یہ عربوں کے کھلے ذہن کی کھلی نشانیاں ہیں اور مشرق و مغرب کے متعصب سے متعصب مورخین نے بھی اس کا ذکر اور اعتراف کیا ہے۔ دانشوروں، وسیع الذہن لوگوں کے بیچ، پاگل یا نیم پاگل اور جنونی لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں، عربوں میں بھی اور ہندوستانیوں اور رومیوں میں بھی اور چینیوں میں بھی، مگر ان پاگلوں کا ذکر نہیں فرزانوں کا ذکر ضروری ہے۔ کبھی کبھی شاعری غلط آہنگ بھی ہوتی ہے، مگر اسی غلط آہنگی کو سب کچھ سمجھنا علم دشمنی ہے۔ معین الدین عقیل اور عزیز احمد نے مخصوص سیاق میں دیانت داری کے ساتھ منفی رویوں کا ذکر کیا ہے۔ کاش جین صاحب بھی غلطی سے چند صحیح مثبت باتیں بھی مسلمانوں کے تعلق سے کرتے۔ معین الدین عقیل کی کتاب میرے پاس نہیں ہے لہٰذا موافقت یا مخالفت میں کچھ کہنا مناسب نہیں۔

وہابیت: وہابیت محمد بن عبدالوہاب کی تحریک تھی، یہ دینی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے ایک اصلاحی تحریک تھی۔ اپنے مذہبی معتقدات کی پاکیزگی اور خالص اسلامی روح اگر ان کی تحریک کا مقصد ہو تو اس میں کونسی غلط بات ہوئی۔ ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے معتقدات کو آنکنے کا حق ہے، مذہب کے نام پر فتنہ و فساد پھیلانے کا نہیں۔

مجدد الف ثانی: شیخ احمد سرہندی معروف بہ مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کی بنیاد اپنی قومیت کے احساس پر ہونا ایسی کونسی معیوب بات ہے۔ اغیار سے نفرت و عداوت ایسے عالم دین کا مقصد ہو ہی نہیں سکتا جس کی بنیاد محبت، مساوات اور رواداری پر ہے۔ میں نے ابھی مجدد الف ثانی کا مطالعہ نہیں کیا ہے، لہٰذا تفصیلات میں جانے سے قاصر ہوں، لیکن صرف سنگھی مضمون نگار محبوب صدا کے بیان پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ مسیحیوں نے ہندوستان ہی نہیں دنیائے اسلام کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی

ہے۔ مذکورہ مضمون بھی اسی نوعیت کا ہوسکتا ہے۔ عزیز احمد نے بھی کس سیاق میں لکھا ہے، اس کی چھان بین بھی ضروری ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ گیان چند کی اس کتاب کی ساری گفتگو معاندانہ ہے اور شرافت کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔

شاہ ولی اللہ کی تحریک: شاہ ولی اللہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں رائج معاشرتی برائیوں کی اصلاح ان کا فرض تھا، انہوں نے وہ فرض ادا کرنے کی کوشش کی تو یہ بات قابل گرفت کیوں کر ہوئی۔ کیا ہندوؤں میں معاشرتی برائیوں کے دور کرنے کے لیے خود ہندو رہنماؤں اور مصلحین نے اس طرح کی کوششیں نہیں کیں؟ راجا رام موہن رائے کی اصلاحی تحریک کیا ہندوؤں کے لیے ضروری نہیں تھی، آریا سماجی اور برہموں کی سماجی تحریکیں کیا ہندوؤں میں اصلاحی تحریکیں نہیں تھیں؟...... شاہ ولی اللہ کی تحریک ہندو تہذیب کے رد کی خاطر نہیں، ہندوؤں کے زیر اثر مسلمانوں میں جو سماجی برائیاں پیدا ہو رہی تھیں، ان کا رد مقصود تھا...... اس ضمن میں گیان چند کی باقی گفتگو بھی زیب داستاں سے زیادہ منافرت پھیلانے کی کوشش ہے۔

علی گڈھ تحریک: علی گڈھ تحریک کے بارے میں عقیل کے بیانات پاکستانی ضرورت ہو سکتی ہے، حقیقت سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہندوستان کی دو آنکھیں کہتے تھے۔ حالات کے مطابق خیالات میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، کبھی شدت اور گرمی پیدا ہوتی ہے اور غصہ کم ہونے پر توازن بھی پیدا ہوتا ہے۔ سرسید کا مجموعی مطالعہ انہیں ہندوستانی قوم پرست ہی ثابت کرے گا قوم دشمن نہیں۔ اور نظریات میں تبدیلیاں یک طرفہ نہیں ہوتیں، عمل کا ردعمل (Action & Reaction) کا نظریہ ہی ان تبدیلیوں کی وجہ ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کی قومی اور مذہبی و اصلاحی تحریکات کا مطالعہ ان واقعات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

پاکستانی جو بھی نظریہ پیش کرتے ہیں اس کی وجہ علمی نہیں بلکہ سیاسی ہوتی ہے، وہ اپنی نوزائیدہ پاکستانی قومیت کی شناخت میں کبھی کبھی ایسی باتیں کرتے ہیں جو گیان چند جین جیسے محققین کے لیے غیر علمی رویہ قائم کرنے میں ممد و مددگار ہوتی ہیں ...... ہندوستانی مسلمان عموماً ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترک ہندوستانی قوم تصور کرتے ہیں اور ہندو اور مسلمانوں کو ہندوستانی قوم کی دو برادریاں مانتے ہیں۔ وہ دو قومی نظریہ کا بطلان کرتے ہیں اور اکثریت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا فکری رہنما مانتی ہے، جو متحدہ ہندوستانی قومیت کے مبلغ تھے ...... جہاں تک دو قومی نظریے کا تعلق ہے، ساورکر، گرو گول والکر، ڈاکٹر امبیڈکر اور لالہ لاجپت رائے کے حوالوں سے اس موضوع پر گفتگو ہو چکی ہے، لہٰذا اسے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کی وضع قطع اور لباس کا سوال ہے، اسلام ایک عالمی مذہب ہے اور مختلف جغرافیائی اور تہذیبی حالات میں مسلمانوں کی وضع قطع اور لباس بدلتا رہتا ہے۔ عرب کا جو بھی لباس ہے وہ اسلامی نہیں، جغرافیائی ہے۔ عرب، ایران، انڈونیشیا، ملیشیا، انگلستان اور دیگر یورپی ممالک اور ہندوستانی مسلمانوں کے لباس میں فرق ہے۔ شیروانی ہندوستان کے منتخب علاقوں میں مسلمانوں میں رائج تھی، مگر حیدرآباد میں ہندو اور مسلمان بھی شیروانی استعمال کرتے تھے، راجستھان میں بھی شیروانی کا رواج تھا اور آج بھی ہے۔ جہاں تک وضع قطع میں داڑھی کا سوال ہے، اس میں بھی مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کی تخصیص نہیں ہے۔ اسلام میں البتہ اس کی تراش خراش کے مسنون طریقے بتائے گئے ہیں۔ اورنگ زیب اور دیگر مغل بادشاہ بھی داڑھی رکھتے تھے اور شیواجی اور رنجیت سنگھ بھی۔

جہاں تک تحریک اتحاد اسلامی کا سوال ہے حزب اللہ اور حزب الشیاطین کی جین صاحب کی تعریف میں ان کی ذہنی افتاد کے مطابق فرق ہے۔ قرآن کریم جب اور جن حالات میں نازل ہوا، اس وقت کے حالات میں اس پر غور کرنا چاہیے۔ اسلامی

تعلیمات میں زور اور زبردستی کی ممانعت ہے (لا اکراہ فی الدین) اور تمہارا دین تمہارے ساتھ اور ہمارا دین ہمارے ساتھ (لکم دینکم ولی دین) کی تعلیم دی گئی ہے اور دوسروں کے مذہب کا احترام کرنے کی بھی ہدایت ہے...... گیان چند کی اپنی دنیا ہے، اس کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں (اور اردو) کے تعلق سے بیر برائے بیر ہے۔ جہاں تک اتحاد اسلامی کا سوال ہے، جین صاحب کے افکار فطالیہ سے زیادہ نہیں۔ ہندوستان پر ایک ہزار سالہ مسلمانوں کی حکومت کے باوجود اور بڑی اقلیت ہوتے ہوئے ان کی تعداد ۱۵ فیصد کے قریب ہے۔ اگر چاہتے تو یہ تعداد آج کم از کم ۵۰ فیصد ضرور ہوتی۔ مگر مسلمانوں کے دور میں زور و جبر کے ساتھ مسلمان بنانے کا جذبہ نہیں تھا، لوگ تلوار کے زور سے مسلمان نہیں بنائے گئے۔ جو لوگ اسلام لے آئے وہ برہمنیت سے بیزار تھے اور اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں آئے، صوفیوں کی خانقاہوں سے متاثر ہو کر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ بادشاہ اگر اس مقصد کے لیے اپنی تلواریں تیز کرتے تو آج مسلمانوں کی تعداد کہیں زیادہ ہوتی، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ دیگر مذاہب خصوصاً ہندو دھرم کے تعلق سے ان کی رواداری اور انصاف پسندی تھی۔

تحقیق میں حقیقتوں کی تلاش کے ساتھ محقق کی اپنی توجیہیں (Interpretations) بھی ہوتی ہیں۔ جیسا میں نے اس سے پہلے لکھا ہے، پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات میں پاکستانی محققین نے اپنی توجیہیں بھی پیش کی ہیں، جن سے اتفاق ضروری نہیں۔ یہ ان کی سیاسی مجبوریاں ہی ہوں گی۔ گیان چند جین صاحب کی زیر نظر کتاب کے تعلق سے توجیہیں بھی فاشسٹ نظریوں کو تقویت پہنچانے کے لیے ہی ہو سکتی ہیں۔ فرمان فتح پوری نے آریائی نسل اور سنسکرت کے بارے میں جو بھی کہا ہو، فی الوقت اس سے سروکار رکھنا ضروری نہیں۔ گیان چند صاحب کی خدمت میں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ نہ سامی نسل کو غیر سامی نسل پر فوقیت حاصل ہے، نہ غیر سامی نسل کو کسی اور نسل پر، یہی حال

زبانوں کا بھی ہے۔ دنیا کی ساری زبانیں بقول سنیتی کمار چٹرجی ایک ہی دریائے سرسوتی کی مختلف شاخیں ہیں یا اس سے جنمی ہیں۔ قرآن حکیم کا بھی ارشاد ہے کہ ''ہم نے مختلف زبانوں کو پیدا کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو'' یعنی زبانیں شناخت کی علامات ہیں۔ اردو والے ہندی والوں میں اور ہندی والے اردو والوں میں فرق یا امتیاز کر سکیں۔ لسانی اور تہذیبی فخر ومباہات کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات کے ضمن میں خطبہ الوداع یا آخری خطبہ کا میں اس سے قبل حوالہ دے چکا ہوں۔ جین صاحب کے اعتراضات اور غیر علمی باتوں کا یہی جواب ہے فروعات میں جانا وقت ضائع کرنا ہے۔

بنیادی تعلیم کے سلسلے کی گفتگو کو بھی غیر اہم سمجھتا ہوں، ان باتوں سے زیادہ خراب باتیں زیر نظر کتاب میں موجود ہیں۔ جہاں تک ''طالبان اور اسلام'' کا تعلق ہے، طالبان کا تعلق نہ اسلام سے ہے نہ ہندوستان سے ہے۔ وہ تو گیان چند جین کے نئے وطن مالوف امریکہ کی دین ہے، خود جین صاحب کا مزاج اور گفتگو طالبانی رنگ لیے ہوئے ہے۔

آپ نے جو کہا بجا، لیکن
آپ پر بھی ہیں چند الزامات

مہا پنڈت راہل سانکرتاین کی کتاب ''آج کی راج نیتی'' کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر رام ولاس شرما کی کتاب ''راشٹر بھاشا کی سمسیا'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ راہل جی کو رام ولاس شرما نے فضول باتوں پر (فضول کا لفظ میرا ہے) پھٹکارا، اس پھٹکار کے مستحق ہمارے جین صاحب بھی ہیں۔ یہاں میں یہ بھی کہتا چلوں کہ سارے مذاہب اور ساری تہذیبیں اپنے آپ کو ارفع واعلیٰ سمجھتی ہیں، برہمن اور جین بھی، تو سمجھنے دیجیے اور آپ کوشش کرتے رہیے کہ ان سب گمراہوں کو ضابطہ اخلاق سکھائیں، اگر آپ میں اتنی سکت ہے۔ سارے مذاہب اخلاق اور روحانی رہبری ہی کے لیے دنیا میں آئے ہیں اور مجھے یہ سارے مذاہب جین صاحب کی طرح کسی طرح

انسان کے لیے لعنت بنتے دکھائی نہیں دیتے۔ کم یا زیادہ حد تک یہ انسانیت کے لیے رحمت ہی ہیں۔ کئی مذاہب ہیں جن میں قدیم مذاہب کی تعلیمات اور روح پوشیدہ ہے، نئی مذہبی کتابوں میں پرانے مذہبی صحائف شامل ہیں۔ پاکستان کا تعلیمی نصاب ہو چاہے بھارتی جنتا پارٹی کی حکومت میں ماضی کی تاریخ پر زعفرانی رنگ کا، یہ ساری باتیں بھی جین صاحب کی زیرِ نظر کتاب کے موضوع سے کوسوں دور ہیں، ان کے بیان کرنے کا مقصد بھی مخفی ہے۔ لہٰذا اسے نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔ تاہم مہاراشٹرا میں نصابی کتابوں میں مسلمانوں کے تعلق سے اس طرح کی کھلواڑ ہوئی ہے، جس کا حکومت نے نوٹس بھی لیا تھا اور تدارک بھی کیا۔

• گیان چند جین کی جس کتاب کے تیسرے باب پر گفتگو ہو رہی ہے، اس کا عنوان ہے ''اردو اور ہندی کے آغاز کی تلاش اور اردو محققین'' لیکن اس موضوع پر کم سے کم گفتگو ہوئی اور فضولیات پر وقت صرف کیا گیا ہے۔ ابتدائی دو پیراگراف کے بعد باب کے آخری ڈیڑھ صفحات ہی کا تعلق اردو سے ہے۔ یعنی یہ کہ:

ا۔ ''اردو کی قدیم تاریخ کو جاننے کے لیے عربی فارسی نہیں، پراکرت اور اپ بھرنش کی واقفیت چاہیے''۔ میں نے گزشتہ صفحات میں اس پر اظہار خیال کیا ہے، یہاں محض تکرار ہے مذکورہ بیان سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ اہل ہندی کی توصیف اور اردو والوں کی تضحیک کے سوا کچھ نہیں:

۲۔ خصوصاً اہل ہندی کی عالمانہ کتابوں کا ذکر ہے، وہ کتابیں میں نے نہیں پڑھیں لیکن ان ناموں سے ضرور واقف ہوں۔ ڈاکٹر نامور سنگھ ہندی کے فاضل عالم اور وِدوان ہیں، ان کی گفتگو سننے کا بھی مجھے موقع ملا ہے۔ اردو ہندی کے تعلق سے ان کے چند مضامین بھی پڑھے ہیں جو مثبت انداز سے لکھے گئے تھے، مجھے خوشی ہے کہ جین صاحب نے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن یہاں بھی وہ سرسری گزر گئے۔ ان کے امام امرت رائے اور ان کا صحیفہ علیہ A House Divided ہے۔ ان کے لیے اس میں جو ارادت

ہندی ہے وہ گیان چند کو مبارک ہو، لیکن اہل اردو کے تعلق سے ان کی جو متعصبانہ رائے ہے، وہ ایک تکلیف دہ امر ہے۔ وہ ہندی کی وکالت کریں، کون منع کرتا ہے، ہمارا تو کہنا صرف یہی ہے کہ اردو اور ہندی دو آزاد زبانیں ہیں جن میں اردو کو قدامت حاصل ہے اور ان کا ادب قابل عزت و احترام ہے۔ ان کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونے والے کروڑوں لوگ ہندوستان اور پاکستان میں بستے ہیں، انھیں اپنے اپنے طور پر ترقی کرنے دیجیے۔ اردو نے ہندی کو دو بڑے ادبی تحفے بھی دیے ہیں، انشاء اللہ خان انشاء اور پریم چند جو بنیادی طور پر اردو کے ادیب ہیں۔ پریم چند نے اردو سے ہندی میں ہجرت کی اس طرح وہ ہندی میں اردو کے مہاجر ادیب اور لسانی وتہذیبی سفیر ہیں۔ اردو کی تازگی اور شگفتگی اور سرسبزی اور شادابی (بقول چٹرجی) سے ہندی والے لطف اندوز ہوتے ہیں اور بیشتر اردو ادب کو دیوناگری میں منتقل کرکے اپنے ہندی قارئین کو اردو کی لسانی جمالیات سے محظوظ ہونے کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے ہندی کو اس طرح کی سہولتیں حاصل ہیں۔ اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں ہوتے ہوئے عالمی سطح پر دو بہت بڑی لسانی طاقتیں ہیں، جو خود بھی ایک دوسرے کو سہارا دیتی ہیں۔ اردو والوں کو ہندی پڑھنے کے مواقع فراہم کیجیے اور ہندی والوں کو اردو، اختلافات کو مت اچھالیے، یکسانیت اور اشتراک کا استقبال کیجیے بقول اقبال۔

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں

آسان اور ملی جلی ہندوستانی زبان اپنی جگہ، گاندھی جی کی ہندوستانی، اردو اور ہندی کے لیے ایک Cover Term بھی تھی، جو دونوں کی حفاظت کرتی ہے۔ یہ اردو اور ہندی کا ازلی رشتہ ہے، اس رشتہ کا پاس اور احترام کیجیے۔ اس جدید سائنسی دور میں میڈیا یا ذرائع ترسیل کی وجہ سے اردو اور ہندی کو انگریزی کے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے۔ آیئے

اتحاد اور اتفاق کے ساتھ ہم اس چیلنج کا مقابلہ کریں۔"

گیان چند نے لکھا ہے کہ اردو ہندی لسانیات پر:

"سب سے اہم اور عالمانہ انگریزی کتاب امرت رائے کی "A House Divided" ہے۔ تاریخی لسانیات میں یہ جیسی عالمانہ کتاب ہے اردو میں کوئی کتاب اس کے چوتھائی کے برابر بھی نہیں ٹھہرتی۔ اردو والوں نے اس کے آخری دو چار صفحے پڑھ لیے اور بانگ لگادی کہ امرت رائے متعصب ہے اور اس کے بعد مطمئن ہو گئے۔ اس کتاب کے محاسن ایک بار پڑھنے سے گرفت میں نہیں آتے۔ اسے کم از کم تین چار مرتبہ کھنگالا جائے تبھی آشکار ہوتے ہیں۔ اہل اردو تو مطالعہ کے بجائے اپنے لسانی تعصب کو کافی وشافی سمجھتے ہیں۔ یہ منطق سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی ہندی کی وکالت کرے تو وہ متعصب ہے اور جو تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں ہندی سے مخاصمت رکھے اور فقط اردو کی وکالت کرے تو وہ بہت بڑا محبّ وطن ہے۔"

گیان چند مذکورہ بیان کے تسلسل میں پھر لکھتے ہیں:

"میں اس کتاب کی تسوید میں ہندی کی قدیم تاریخ کی وضاحت کے لیے ہندی کی اصطلاحیں اور نمونے استعمال کروں گا۔ جنہیں یہ شبد بھنڈار پڑھنا گوارا نہ ہو وہ ان اوراق کو پلٹ کر آگے بڑھ جائیں۔ میں اپنے سرسری مطالعے کے مختصر نتائج امرت رائے کے الفاظ میں پیش کرنے پر مجبور ہوں۔ اردو والوں کا یہی مزاج ہے کہ وہ اپنے ملک کی زبانوں ہندی سنسکرت سے پرے پرے رہتے ہیں اور دور دراز کی طرف دوڑتے ہیں، لیکن اردو اور ہندی

کے آغاز کی بات محض اصطلاحوں کا معاملہ نہیں۔ وہ تو ہندی کے اجداد، اپ بھرنش، پراکرت، سنسکرت اور ویدک بھاشا سے اچھی جانکاری کی بات ہے۔ اردو والوں کو ان زبانوں اور ان کے الفاظ سے ایک جھڑک، ایک چڑ ہے۔"

گیان چند کے مذکورہ بیانات اردو اور بین السطور میں مسلمانوں سے دلی بغض اور نفرت اور تعصب کی واضح مثال ہیں اور پیشکش غیر علمی ہی نہیں شرافت کے دائرہ سے بھی خارج ہے۔ کوئی بات اگر شرافت کے دائرے سے خارج ہو تو اس پر گفتگو کرنا ضروری نہیں۔ چند امور البتہ قابل بحث ہیں:

ا۔ امرت رائے کی کتاب گیان چند کی نظر میں صرف عالمانہ نہیں، بہت عالمانہ علم لسانیات کا شاہکار ہو سکتی ہے، وہ اسے اردو اور ہندی کی تاریخی لسانیات میں بلند ترین مقام پر فائز کر سکتے ہیں۔ لیکن دوسروں کو اختلاف کرنے سے منع نہیں کر سکتے اور مخالف آرا کی تضحیک نہیں کر سکتے۔ اس کتاب کی تصنیف کے وقت جس طرح امرت رائے کی گیان چند سے خط و کتابت تھی اور انہوں نے جو اردو کے خلاف مواد جمع کر کے دیا (بین السطور سے یہی اندازہ ہوتا ہے) اور جس کا امرت رائے نے شکریہ بھی ادا کیا، اسی طرح امرت رائے نے راقم الحروف سے بھی خط و کتابت کی تھی اور میں نے اردو کے تعلق سے وافر مواد جمع کر کے دیا، جو اردو کے حق میں تھا۔ اس سلسلے میں امرت رائے نے ہندوستانی پرچار سبھا، ممبئی کے سیکریٹری جناب شانتی لال شاہ کو بھی خط لکھا تھا اور انہوں نے بھی مجھ سے گزارش کی تھی کہ اس سلسلے میں ان کی مدد کروں کہ یہ اردو + ہندی سے متعلق ہے، جو مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کا مقصد ہے۔ امرت رائے نے اس مواد کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے لکھا ہے:

"All the early Hindustani literature was in poetry.

and this literary from the speech was named "Rakhta" or "scattered," from way in which the words borrowed from persian were scattered through it. The name was applied to the dialect used in poetry, urdu being the dialect of prose and of conversation. The introduction of these borrowed words, which has been carried to an even greater extent in urdu, was facilitated by the fact that Persian was the official language of the Mogul court. In this way, Persian (and, with Persian, Arabic) words came into current use and, though the language remained Indo-Aryan in its grammar and essential characteristics, it soon became unintelligible, in its elegant form, to anyone who had not at least a moderate acquaintance with the vocabulary and literature of Iran. (This extreme persianization of Urdu in the earlier days was probably the work of Hindu officials employed by the Mogul administration and acquainted with Persian, rather than by the muslim elite who normally would prefer the persian languuage itself. It is clear that in the days

of the Mogul empire, Urdu began to develop and its use as a literary language followed a natural course. It exercised a strong influence on the development of spoken Hindustani, contributing a measure of standardization.

Hindi scholars are inclined to nullify the effects of Urdu upon the formation of Hindi through their labours on sankritization to replace Persian elements. Up to the 19th century, the only literary forms which arose from colloquial Khari-boli, and gave some stability and prestige, must be described as Urdu.

(Encyclopaedia Britanica Vol 11 page 514-515 (1968)

۱۹۷۳ء میں عالمگیر شہرت کے ماہر لسانیات پروفیسر سنتی کمار چٹرجی نے ریسرچ سنٹر کی دعوت پر تین مہاتما گاندھی میموریل خطبات دیئے تھے۔ جین صاحب اور امرت رائے دونوں کو اس کا علم تھا اور ان کے پاس ان مطبوعہ خطبات کا نسخہ بھی تھا۔ امرت رائے نے راقم کو خط لکھ کر ایک نسخہ حاصل کیا تھا۔ سنتی کمار چٹرجی کے خطبات کا موضوع تھا:

India: A Polyglot Nation and its Linguistic Problems Vis a vis National Integration.

سنتی کمار چٹرجی ۱۹۳۰ء کے اپنے خطبات میں جو "ہند آریائی اور ہندی" کے

عنوان سے انگریزی میں شائع ہوئے تھے اردو کے تعلق سے غلط فہمیوں کا شکار تھے اور مخالفانہ رائے رکھتے تھے، لیکن بتیس سال بعد جب مذکورہ خطبات دیے تب اس میں انھوں نے ڈاکٹر تاراچند کے حوالے سے لکھا کہ:

"ڈاکٹر تاراچند سے میری گفتگو ہوتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ اصل زبان اردو ہے اور ہندی نے بعد میں ترقی کی، لیکن اس وقت میں نے ان کی بات قبول نہیں کی، لیکن عمر کے آخری حصہ میں میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ تاراچند صحیح تھے اور میں غلط تھا"

مذکورہ اعتراف کے ساتھ اپنے خطبات میں چٹرجی نے لکھا کہ:

"اصل زبان اردو ہے اور ہندی اردو کے جوتوں میں پاؤں رکھ کر چلنے کی کوشش کی جارہی ہے۔" اور پھر کہا کہ

"اردو کی خوشبو اور سرسبزی و شادابی ہندی کو دور دور تک نصیب نہیں۔"

ہند آریائی کے ایک بے بدل عالم چٹرجی کی یہ حتمی آخری رائے تھی اس کے بعد ۱۹۳۰ء کی رائے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ امرت رائے اور گیان چند کے پاس یہ خطبات موجود تھے۔ لیکن نہ امرت رائے نے مذکورہ خطبات کا حوالہ دیا نہ گیان چند جین نے کہیں اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا۔ یہ علمی بددیانتی ہے جس کے یہ دونوں پیر (امرت رائے) اور مرید (گیان چند) مرتکب ہیں۔

چار سال قبل غالباً اکتوبر۔ نومبر ۲۰۰۲ء میں گیان چند صاحب امریکہ سے ہندوستان آئے تھے، وہ بمبئی بھی آئے اور مجھ سے فون پر گفتگو کی اور ملاقات نہ ہونے پر (وہ بمبئی سے زیادہ واقف نہیں ہیں کہ وہ خود آکے مجھ سے مل لیتے) افسوس کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ آپ بتائیے کہ آپ کا قیام کہاں ہے؟۔ میں خود آپ سے نیاز حاصل کروں گا" ...... اس وقت وہ اندھیری میں اپنی بھتیجی کے یہاں مقیم تھے۔ میں اسی شام

وقت معینہ پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام کلام کے بعد جین صاحب نے کہا کہ "آپ نے امرت رائے کی کتاب A House Divided پڑھی! اور اس کے بعد کتاب اور صاحب کتاب کی قصیدہ خوانی شروع کی، جس کے حوالے اس کتاب میں شامل ہیں۔ میں ان کی باتیں غور سے سنتا رہا، جب وہ رک گئے تو میں نے کہا کہ جین صاحب! آپ جس کتاب کی اس قدر تعریف کر رہے ہیں وہ انتہائی زہر آلود کتاب ہے اور اردو کے خلاف جس کسی نے مواد فراہم کیا وہ تو انہوں نے استعمال کیا لیکن میرے بھیجے ہوئے مواد کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ میں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "انہوں نے (امرت رائے نے) سنیتی کمار چٹرجی کے لیکچر بھی مجھ سے منگوائے تھے جس میں آخری بار ہندی اردو کے تعلق سے انہوں نے اظہار خیال کیا تھا، اس کا بھی امرت رائے کی کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔ یہ امرت رائے کی بددیانتی ہے"۔ جین صاحب نے کہا "نہیں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے"۔ میں نے کہا "بالکل نہیں"۔ کہنے لگے "کتابیات میں اس کا ذکر ہے"۔ میں نے کہا "نہیں کتابیات میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے" اور یہ منصوبہ بند طریقے پر بے ایمانی ہے"۔ جین صاحب خاموش ہو گئے۔ اب جب جین صاحب کی اردو دشمن کتاب آئی ہے، تو اس میں بھی چٹرجی کی مذکورہ کتاب کا حوالہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں چٹرجی سے اختلاف کرنے کا حق ضرور تھا، مگر اس اہم کتاب کو نظر انداز کرنے کا حق نہیں تھا۔

میں اس ملاقات کے وقت دو کتابیں اپنے ساتھ جین صاحب کے لیے تحفتہً لے گیا تھا، ایک بیگم میمونہ دلوی کی کتاب "کوکن اور ممبئی کے اردو لوک گیت" اور دوسری اپنی کتاب "پونے کے مسلمان" ...... جین صاحب نے کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھیں اور کہا کہ ہاں ...... اردو گیتوں سے مجھے تھوڑی دلچسپی ہے، اسے آپ بذریعہ ڈاک بھیج دیجئے اور "پونے کے مسلمان" دیکھ کر کہا کہ "مجھے مسلمانوں وسلمانوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے" ...... پانچ دس منٹ کے بعد میں نے اجازت لی اور ان کے پاس سے رخصت ہوا

لیکن ان کی گفتگو خاص کر آخری جملہ میرے لیے سخت تکلیف دہ اور تحقیر آمیز تھا۔

میں نے اس ملاقات کا ذکر تفصیل سے اس لیے کیا ہے کہ اس سے جین صاحب کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور ساتھ ہی امرت رائے اور گیان چند کی تحقیق اخلاقیات کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اس طرح کی کتنی تحقیقی بددیانتیاں ان کتابوں میں شامل نہ ہوں گی؟ قارئین اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ گیان چند اہل اردو پر تعصب کا الزام دھرتے ہیں، کاش وہ اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھیں۔ ہندی اور اردو دونوں ترقی یافتہ زبانیں ہیں، ہند آریائی کی بیٹیاں ہیں۔ ان کا وافر ادب بھی عام زبانوں میں ایک امتیاز رکھتا ہے۔ کوئی ہندی کی وکالت کر سکتا ہے تو کوئی اردو کی وکالت، یہ سب اپنے علم، ذاتی پسند اور مطالعہ پر منحصر ہے، نہ یہ برا ہے نہ وہ برا ہے۔ برا تعصب ہے جو امرت رائے اور گیان چند کے رگ و ریشے میں سمایا ہوا ہے۔ ہر کوئی اپنی رائے رکھ سکتا ہے اور گیان چند کی طرح اپنی رائے رکھنے پر مجبور ہے۔

گیان چند کا یہ کہنا کہ:

"اردو والوں کا یہی مزاج ہے کہ وہ اپنے ملک کی زبانوں، ہندی، سنسکرت سے پرے پرے رہتے ہیں اور دور دراز کی طرف دوڑتے ہیں" بھی ظلم ہے، جینی اہنسا پسند ہوتے ہیں وہ ایک معمولی چیونٹی کو بھی ایذا نہیں پہنچاتے، لیکن گیان چند جین صاحب نے اردو والوں کے جذبات کا جو ناحق خون کیا ہے، اس کا جواز کیا ہے۔ اردو والے ملک کی زبانوں سنسکرت اور ہندی سے پرے پرے کبھی نہیں رہے۔ سنسکرت سے پرے رہ بھی کیسے سکتے ہیں، اردو سنسکرت کی بیٹی، اس کی صوتیات اس کے تابع، اس کی قواعد کی بنیاد کا پتھر سنسکرت، ذخیرہ الفاظ یا شبد بھنڈار کا نصف سے زائد حصہ سنسکرت کی دین، تو اس کا مطالعہ ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں، ہاں اتنا ہی اوجھل ہے جتنا ہندی سے یا دوسری زبانوں سے اوجھل ہے۔ جس طرح قرآن و حدیث کے ترجمے مسلمانوں کے مطالعہ کے لیے عربی سے اردو میں ہوئے، ویسے ہی اردو داں ہندو احباب نے

مہابھارت، رامائن، گیتا، پُران اور دیگر سنسکرت صحائف کے ترجمے مذہبی ضروریات کے تحت اردو میں بھی کیے۔ ممبئی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر صاحب علی نے ۸۰ کے قریب اردو میں گیتا کے ترجموں کی نشاندہی کی ہے۔ حیدرآباد کے سکالر ڈاکٹر حسن الدین احمد نے بھی گیتا کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ بھرتری ہری کے دو سو شلوکوں کے منظوم ترجمے راقم الحروف نے اردو میں کیے ہیں، اس کے علاوہ بھی کئی ہندو اور مسلمان اہل قلم نے اس کے اردو ترجمے کیے ہیں۔ اقبالؔ بھرتری ہری کے بڑے مداح تھے، انہوں نے اپنے جاوید نامہ میں بھرتری ہری کو سب سے اعلیٰ مقام پر (جنت الفردوس) بٹھایا اور جو خراج عقیدت پیش کی ہے ویسا نادر خراج عقیدت شاید ہی کسی دوسری ہندوستانی زبان میں کیا گیا ہو۔ ''گائتری منتر'' کا ترجمہ بھی گیان چند کے معتوب اقبال ہی نے اردو میں کیا ہے، جو بانگ درا میں شامل ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ مشرق ومغرب کے نغمے (میراجی) اور سازِ مشرق (حسن الدین احمد) میں بھی سنسکرت کے ترجمے موجود ہیں۔

گیان چند کا یہ آخری جملہ جواب طلب ہے۔

> ''تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں ہندی سے مخاصمت رکھے اور فقط اردو کی وکالت کرے تو وہ بہت بڑا محبِ وطن ہے''۔
> (ص ۶۷)

• گیان چند کی تحقیق کا مجموعی انداز قیاسات پر مبنی ہے۔ انہیں تو اردو والوں کی صرف برائیاں ہی دکھائی دیتی ہیں۔

ا۔ تقسیم ایک بہت بڑا المناک واقعہ ہے، جس کے لیے عام اردو والا ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ گھٹیا سیاست کا نتیجہ ہے جس میں ہندو اور بطور خاص فرقہ پرست ہندو اور مسلم لیگ (بعد ا) شامل ہوئی۔ بیرسٹر ساورکر، گروگول والکر وغیرہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ کانگریس کو جو ہماری قومی سیاسی جماعت تھی چاہیے تھا کہ وہ تقسیم ہند پر راضی نہ ہوتی،

لیکن وہ راضی ہوگئی، سوائے مولانا آزاد کے۔ اب جب تقسیم ہوگئی تو ایک اعلیٰ ثروت مند، رابطہ کی اور اعلیٰ ادب کی زبان اردو کا کیا قصور تھا؟ کہ اس کی وکالت نہ کی جاتی یا نہ کی جائے؟ زبانوں کا قتل بھی قتل آدم سے کم نہیں ہے۔

آج مسلمانوں میں سنسکرت سے واقفیت کم ہے۔ نصف صدی قبل تک اردو، سنسکرت اور ہندی اور فارسی و عربی کے دو لسانی عالم اور ودوان ہوا کرتے تھے۔ یہ ہمارے لسانی منظر نامہ کی ایک صحت مند علامت تھی، اب یہ روایت کم ہی نہیں تقریباً مفقود ہوگئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس ذولسانیت کو فروغ دیا جائے۔ گاندھی جی نے ۱۹۰۹ء میں قومی زبان کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے "ہند سوراج" میں لکھا تھا:

> "ہر پڑھے لکھے ہندوستانی کو اپنی بھاشا، ہندو کو سنسکرت، مسلمان کو عربی، پارسی کو فارسی اور سب کو ہندی جاننی چاہیے (بمعنی ہندوستانی۔ دلوی)۔ کچھ ہندوؤں کو عربی اور کچھ مسلمانوں کو اور پارسیوں کو سنسکرت سیکھنی چاہیے۔ اتر اور پچھم میں رہنے والے ہندوستانی کو تامل سیکھنی چاہیے۔"

کثیر لسانی ہندوستانی سماج (Plural Indian Society) میں اس کی اہمیت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ افسوس ہے کہ سنسکرت زبان و ادب کے مطالعے اب ہندوؤں میں بھی کم ہو رہے ہیں۔ مہاراشٹر میں ہندوستانی زبانوں کی ماں، سنسکرت کے مطالعوں سے اغماض برتا جا رہا ہے اور اکثر کالجوں سے سنسکرت کے شعبے ختم کیے گئے ہیں، سنسکرت، فارسی اور عربی ہمارے نصاب کی اہم زبانیں ہیں جو لسانی، ادبی اور تاریخی تحقیق کا ماخذ ہیں۔ ڈاکٹر جین مسلمانوں کے سنسکرت نہ جاننے پر معترض ہیں، اب تو خود ہندوؤں میں سنسکرت دانی کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔

گیان چند جیسے اردو کے اساتذہ اور محقق، زندگی بھر اردو سے فیض اٹھاتے رہے، پروفیسری پر فائز رہے، انعام و اکرام سے نوازے گئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے

کے بعد وہ بھلے ہی اب ہندوستان میں اردو کی وکالت نہ کریں، لیکن ہندی اور غیر ہندی حلقوں میں ایسے بہت سے انصاف پسند ہندو عالم اور دانشور ہیں جو اردو کو دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح ترقی دینے کی پرزور تائید کرتے ہیں۔ میں صرف ایک مثال پر اپنی گفتگو ختم کروں گا۔ مشہور ماہر معاشیات اور سابق وزیر تعلیم حکومت ہند، ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ اردو کی ہندوستان میں وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "Urdu is one of the country's national languages and should be encouraged in its development as much as any of the other languages listed in the eight schedule of constitution. And same facilities should be given for learning it by those whose mother - tongue it is as are provided for the Indian languages which are the mother - tongue of other Indians." (1)

گیان چند نے قیاس آرائی کرتے ہوئے ہندوستان کے مسلمان طلبہ اور اساتذہ کا پاکستان سے کافی رابطہ رہنے کا ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ عزیزوں سے ملنے کے لیے پاکستان جاتے رہتے ہیں اور مزید یہ کہ پاکستان کے طرز تعلیم اور نصاب کا ان پر ضرور اثر پڑتا ہوگا۔ (دیکھیے ص ۶۵)

مذکورہ بیان جین صاحب جیسے عالم کے شایان شان نہیں ہے۔ میں اور میرے دوست اور احباب اور میرے اساتذہ کبھی پاکستان نہیں گئے، نہ ہی میرا کوئی شاگرد آج تک پاکستان گیا ہے۔ یہی حال دوسری ہندوستانی یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ کا بھی ہوگا۔ جین صاحب نے یہ نتیجہ کیسے برآمد کیا کہ اس کا اثر (پاکستانی نصاب تعلیم کا) ان پر

(1) Dr. V.K.R.V. Rao: Many languages and one nation; The problem of integration; MGM resarch center library, hindustani prachar sabha, mumbai, 1979, page 43-44

ضرور پڑتا ہوگا۔ ہندوستانی مسلمان طلبہ اور اساتذہ شاذ و نادر ہی پاکستان گئے ہوں، یا تحقیقی ضروریات کے لیے یا کسی رشتہ دار سے ملنے، عموماً وہ پاکستان جانے کے خیال سے ہی خوف کھاتے ہیں کہ کہیں یہ سفران کے لیے پریشانی کا باعث نہ بنے۔ چند ایک اساتذہ گئے ہوں گے اعلیٰ سرکاری خیر سگالی وفد میں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر گیان چند نے ضرور ایک سے زائد بار پاکستان کا سفر کیا ہے، اسی طرح رشید حسن خان اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی و ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی۔ ان کے یہ سفر خیر سگالی سفر تھے۔ کیا جین صاحب ان پر بھی الزام دھریں گے؟ گیان چند جین صاحب نے اپنے شاگرد ڈاکٹر حبیب نثار کے نام خط میں اپنے پاکستان کے سفر کا ذکر کیا ہے۔ لکھنو سے اپنے مکتوب مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۹۷ء میں لکھتے ہیں: (۱)

> ''پاکستان کا دورہ اچھا رہا، ہم لوگ ایک ہفتہ کراچی اور ایک ہفتہ لاہور میں رہے، وہاں جاکر جی بہت خوش ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہاں کے ادیبوں، اردو کے استادوں اور طلبہ نے الفت و احترام کی حد کردی۔''
>
> دعا گو گیان چند

اس طرح کی الزام تراشیاں (بین السطور میں) اور وہ بھی محض قیاسات پر، نازیبا اور اخلاق سوز ہیں۔ یہ اسی طرح کی غلط بیانی ہے جس طرح کی اردو اور ہندوستان اور ہندوؤں کے بارے میں پاکستانی سکالروں نے کی ہے۔ میں نے گزشتہ صفحات میں اسی پروفیسر ہاشم کے حوالے سے ہندوستان کے شاندار ماضی کے تعلق سے اظہار خیال کیا ہے۔ سب کی ذمہ داری تو میں نہیں لیتا لیکن عام اردو پڑھا لکھا اور ان پڑھ مسلمان طبقہ اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتا ہے اور اپنے مقامی لسانی اور تہذیبی ورثہ پر بھی، لوک گیتوں اور لوک کہانیوں پر بھی اور رسم و رواج پر بھی اور شاندار تاریخی ورثہ پر بھی جس

(۱) گیان چند کا مکتوب بنام ڈاکٹر حبیب نثار (شعبہ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی، حیدرآباد)۔

میں اجنتا اور ایلورا بھی ہیں، کونارک کے مندر بھی ہیں اور تاج محل اور دلی کی جامع مسجد بھی۔ جین صاحب تو اردو کے ہمارے سینئر پروفیسر رہے ہیں۔ انہوں نے سکندر علی وجد کی شاہ کار نظمیں ''اجنتا'' اور ''ایلورا'' ضرور پڑھی ہوں گی اور یہ نظمیں کہنے کا تاریخی پس منظر بھی انہیں یاد ہوگا۔ ایسی نظمیں اپنے ورثہ سے جذباتی لگاؤ کے بغیر کہی نہیں جاسکتیں۔

اردو اور ہندی میں ایک واضح فرق ہے۔ اس فرق کا اندازہ گیان چند اور امرت رائے جیسے دوانوں کو چاہے نہ ہو لیکن لسانی حسیت (Sensitivity) رکھنے والے ہر شخص پر یہ فرق واضح ہے۔ عام لوگ بھی اس کا اندازہ کرتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں ہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا بیان ''گوش حقیقت نیوش'' کی خاطر پیش کرتا ہوں۔

غالباً ۱۹۹۳ء کا واقعہ ہے، میں بمبئی یونیورسٹی میں اپنے شعبہ میں مصروف تھا کہ میرا ایک کلرک جو مراٹھی داں تھا، آٹھ دس نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو میرے پاس لے آیا، وہ اردو سیکھنے کے خواہشمند تھے۔ ان سے گفتگو کے دوران میں نے اردو سے ان کے شوق کی وجہ جاننی چاہی، تو مختلف جوابات ملے، جیسے انہیں اردو بہت میٹھی زبان لگتی ہے۔ کسی نے غزل سے دلچسپی کا اظہار کیا تو کسی نے قوالی سے۔ میں نے ان کے ذوق شوق کے پیش نظر ان سے کہا کہ وہ اگلے ہفتے سے دوپہر میں آئیں تو میں انہیں اردو سکھاؤں گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سارے نوجوان تھیٹر اور سینما میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھی اردو جانے بغیر وہ تھیٹر یا سینما میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اسی وقت میرا کلرک مورے شرماتے ہوئے میرے پاس دوبارہ آیا اور کہنے لگا کہ اگر میں اجازت دوں تو وہ بھی اردو کی کلاس میں شریک ہوگا۔ میں نے پوچھا ''تم کو ہندی تو آتی ہے، پھر تم اردو کیوں سیکھنا چاہتے ہو، جس طرح ہندی ہے اسی طرح اردو بھی ہے''۔ کہنے لگا:

''نہیں ہندی اور اردو میں تو بہت فرق ہے''۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا فرق

ہے، تو اس نے جواب دیا کہ "جو ٹی۔ وی (T.V) پر سیریل ہوتے ہیں اور جو فلمیں دکھائی جاتی ہیں ان کی زبان اردو ہوتی ہے اور T.V خبروں کی زبان ہندی ہوتی ہے۔ اوران دونوں میں بہت فرق ہے۔ مجھے اردو بہت میٹھی لگتی ہے۔ لہٰذا میں اردو سیکھنا چاہتا ہوں۔" ...... یہ لسانی شدبد رکھنے والے عام آدمی کی لسانی حسیت (Language Sensitivity) ہے۔ سیاست داں اور غیر جانبدار ماہرین لسانیات جو دونوں زبانوں میں تمیز کر سکتے ہیں، اس بات سے ضرور متفق ہوں گے، ضد کی بات اور ہے، بقول مولانا ابوالکلام آزاد "لوگ ماننے پر آتے ہیں تو پتھر کو بھی خدا بنا دیتے ہیں اور انکار پر آتے ہیں تو عیسیٰ کو بھی سولی پر چڑھا دیتے ہیں"۔...... جانبدار سیاست داں اور ماہرین لسانیات کا حال بھی اردو اور ہندی کے تعلق سے اسی نوعیت کا ہے۔ کچھ لوگ یقین اور بے یقینی کی دہلیز پر کھڑے رہ کر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ میں نے ایمانداری سے عرصہ تک گاندھیائی ہندوستانی کی خدمت کی ہے اور اردو اور ہندی سے واقف ہوں اور اردو اور ہندی میں تمیز کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب ان دونوں زبانوں میں جو فرق ہے اسے لسانی سیاست سے اوپر اٹھ کر صدق دل سے قبول کرنا چاہیے۔

گیان چند صاحب کی کتابیات میں مشہور امریکی ماہر لسانیات جی۔ اے۔ گلیسن G.A Gleason کی کتاب Introduction to Descriptive Linguistics شامل لیکن اردو اور ہندی کے تعلق سے اس کی رائے پر غالباً ان کی نظر نہیں پڑی، مسئلہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ گلیسن کا یہ طویل اقتباس، قابل مطالعہ ہے۔

ہے:

All these forces may interact to produce very complex relationships between speech and writing - how complex may best be seen in a situation where there are two competing written

languages associated with the same spoken dialects. One such case is in northern India. One written language, known as Urdu, was developed in a Muslim cultural environment and uses the persian from of the Arabic alphabet. The other, Hindi, was developed in a non - Muslim environment and uses the Nagari script which was borrowed from Sanskrit. These are more than merely two forms of writing for the same language. If Urdu is transcribed into Nagari, this still recognizably Urdu. There are many other differences, and the two must be considered as more or less independent written languages, each with its own characteristic structure and vocabulary. The two differ in part because they were originally based on somewhat different spoken dialects. Each has spread over a very large and linguistically diverse territory. There are however, areas in which Urdu is rarely used, even by Muslims, but where Hindi is the prevailing written language. There are also areas where Urdu is used but not Hindi. Since they have not

been used in identical territories, they have been subject to different influences from spoken dialects. The external influences have also been different. Urdu has been subject to influence from Persian, and this has affected everly level of strûcture, not only vocabulary. In Hindi the Persianizing forces have been much weaker, but there has been a strong pressure for conformity to Sanskrit patterns. Probably most important of all, however, is the fact that each has developed more or less independently or the other. The historical developed more or less independently of the other. The historical changes which are inevitable in any language, spoken or written have been different. As a result, Hindi and Urdu show important and quite evident differences, and both are quite different from the spoken dialects of the area. (1)

ممتاز ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی ہندی کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

(1) G.A. Gleason: An Introduction to Descriptive Linguistics (1961) by Holt Rinchart A Winstone Pages 437 - 8

"The regard for Hindi as the great modern languages of Aryavartes was there already in Bengal. On the other side of India, Maharisti Dayananda Saraswati, originally from Gujarat, after his visit to calcutta, started the Arya Samaj in the Punjab with a view to reform hindu society and to revive the vedic religion as he interpreted it and he took up Sanskritic nagari Hindi as an effective means of chacking denationalisation among Hindus who were reading and using only Persian and Urdu and were immersed in the atmosphere of Islam" (Indo - Aryan & Hindi (1960 ed. Page 158)

مذکورہ اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید سنسکرت آمیز ہندی، ہندوستانی یا اردو کے خلاف شعوری طور پر ہندوؤں کے لیے بنائی جارہی تھی۔ اسے عام فہم ہندوستانی یا اردو کے خلاف ایک لسانی سازش کے طور پر منصوبہ بند طریقے سے استعمال کیا گیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین جو جگہ جگہ مسلمانوں اور اردو والوں کی تنگ نظری کا شکوہ کرتے ہیں، ہندی والوں کی اس تنگ نظری کے بارے میں بھی اظہار رائے کر سکتے تھے۔ اردو کے خلاف یہ لسانی منصوبہ بند سازش بنگال، گجرات اور پنجاب میں پروان چڑھائی گئی۔ چٹرجی لکھتے ہیں کہ بنگال کے ماہر تعلیم اور برہمو سماج کے مبلغ نوین چندر رائے (Navin Chandra Roy) نے سنسکرت آمیز ہندی کی دیانند سے پہلے وکالت کی تھی جو صحیح معنوں میں پنجاب اور اتر پردیش میں ہندوؤں کی زبان کے طور پر ترقی کر رہی تھی۔(۱)

---

(1) Chatterji S.K. Indo - Aryan and Hindi page 158 Firwa K.L. Makhaopadhva. Calutta, 1960.

زبانیں صرف الفاظ اور ان کے معنوں کا اظہار نہیں ہوتیں۔ انہیں فلسفیانہ قیل وقال سے نہیں سمجھا جاسکتا اور نہ وہ سائنسی اور ریاضی فارمولوں کی طرح کام کرتی ہیں۔ ان کے آغاز اور ارتقا میں تاریخ اور تہذیبی زندگی نمایاں ہوتی ہے۔ جدید ہندی کے برعکس اردو اور ہندوستانی کا ارتقا مخصوص تاریخی وتہذیبی حالات میں ایک فطری ارتقا تھا، اس کا بننا اور سنورنا حالات کے تابع تھا، جسے اس کے شاعروں اور ادیبوں کی منصوبہ بندی نے معیار عطا کیا۔ زبان کے بننے اور سنورنے میں سماجی اور تہذیبی زندگی بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ ہیری ہوئیر نے اپنی مشہور کتاب ''زبان اور تہذیب'' Language and Culture کی ابتدا میں لکھا ہے:

> 'Natural language is not devised by philosophers but develops as a living instrument of a community in its adjustment to a variety of changing needs, one would not expect and, in my experience at least, one does not find any underlying semantic patterns such as would be required for the semantic system of language to reflect some over - all world view of a metaphysical nature.' (1)

بنجامن ہورف Benjamin whorf جس نے زبان اور تہذیب کے رشتے پر اپنا نظریہ پیش کیا تھا اور جو ماہرین لسانیات اور تہذیبی علم بشریات Cultural Anthropology کے عالموں میں مرکز توجہ بنا رہا، اس کے خیال کے مطابق:

(1) Harry Joijer (Ed.) Language in Culture. The University of Chicago Press - 1960 Page 18.

"It is Whorf's view that the linguistic patterns themselves determine what the individual perceives in his world and how he thinks about it. Since these patterns vary widely, the modes of thinking and perceiving in groups utilizing different linguistic systems will result basically different world views. Briefly stated, according to Whorf, language shapes our ideas rather than merely expressing them. (1)

اردو کے تعلق سے امرت رائے اور گیان چند کے گروہ کی نتائج کو جن کا ذکر اس کتاب میں میں نے بار بار کیا ہے، مذکورہ سیاق میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبانوں کی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں:

"Urdu, which was studied by both Hindus amd Muslims, was naturally selected as the common language of India. Unfortunately the zeal for finding distinctions led the professors of the college to encourage attemts to create a new type of Urdu from which all Persian and Arabic words

---

(1) Ibid An Examination of the Conceptions of Benjamin Whorf.... by Franklin Fearing Page-47.

were removed and replaced by Sanskrit words. This was done ostensibly to provide the Hindus with a language of their own. But the step had far reaching consequences, and India is still suffering from this artificial bifurcation of tongues." (1)

"Urdu, however, was regarded by both Hindus and Mussalmans of the 18th century as their lingua franca. Bhartendu Harishchandra, one of the pioneers of modern Hindi, acknowledged in the middle of the 19th century that Urdu was the language of polite speech in the North even among the members of his community (Agarwals). So when the East India Company ordered the establishment of the Fort William college in Calcutta to teach Indian Languages to their officers, Urdu was the language for which teachers were appointed, as also for the classical languages, Arabic, persian and Sanskrit and provincial languages like Bengali and Brajbhasha.

---

(1) Dr Tara Chand: The Problem of Hindustani (Allahbad - 1944) Page 57-58.

Modern Hindi was till then unknown, for no literature existed in it. It was at this time that it began to be employed for literary purposes. The professors of the college encouraged Lalloji Lal and other teachers to compose books in the language used by the Urdu writers, but to substitute Sanskritic words (tatsama) for Persian and Arabic words. Thus the new style was born which was considered specially suited to the requirements of the Hindus, and the Christian missionaries gave a fillip to it by translating the Bible in it.

The new style (which is now known as Hindi) took a long time to become popular. In fact it was only after the Mutiny of 1857, that Modern Hindi began to attract attention. Special efforts were made to foster it. It was about this time that Beames, Kellog and others wrote grammars to establish its claims. Even Pronvincial Governors went about dissuading people from the use of Urdu.

After a few years (about 1872) the anti-Muslim bias began to die out and a reaction came in

favour of Urdu. The Ilber Bill agitation in Bengal and national stirrings in other parts of India were causing alarm and it was not political to keep the Muslim community perpetually under disfavour. Sir W.W. Hunter and some other officers began to advocate their cause, and to promote cultural particularism. When the Indian National Congress was founded, the Muslims considered it in their interests to remain aloof. In the atmosphere of communal rivalry the seeds of Hindi-Urdu controversy germinated.

Although Modern Hindi is a recent growth, for its beginnings do not go beyond the 19th century and its real development has taken place within the last sixty years, it has made rapid strides, and tody the situation is that a large number of people read and write it and numerous books and journals are published in it, so that its popularity is daily on the increase. Urdu literature has also made great progress, and at least one University in the country has adopted it as the medium of instruction." (1)

(1) Tara Chand: The Problem of Hindustani (Allahbad) 1944 31-33.

قدیم دلی کالج اپنے عہد کا ایک ممتاز تعلیمی ادارہ تھا، جہاں سے علم کی روشنی پھیلی۔ اس کالج کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے جدید سائنسی علوم کے فروغ میں بنیادی رول ادا کیا اور اردو کی مقبولیت اور رابطہ کی زبان کی حیثیت سے اس کی اہمیت کے پیش نظر اردو کو علمی زبان بنانے کی کوشش کی اور پہلی بار اردو میں اصطلاح سازی پر توجہ دی گئی۔ ماسٹر رام چندر جو اردو کے ایک ممتاز ادیب ہیں اور جنہیں اردو میں انشائیہ رمضمون نگاری میں بہت شہرت حاصل ہے، دلی کالج میں ریاضی کے استاد تھے۔ وہ اردو کی ترقی کو ملک وقوم کے لیے ضروری سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اردو ہندوستان کی مقبول ترین زبان ہے جو مشرق سے مغرب تک ایک وسیع علاقہ میں عملاً استعمال ہوتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو جو یہاں کی مقبول ترین زبان ہے علمی زبان بنے اور سارے علوم وفنون جو انگریزی میں تھے، اردو میں بھی منتقل ہوں۔ اکتوبر ۱۸۴۷ء کے "خیر خواہ ہند" میں انہوں نے لکھا ہے:

> "زبان انگریزی کے ذریعہ سے اس قدر شیوع علوم مفیدہ کا نہیں ہوسکتا ہے...... تاکہ ہندوستان کے آدمی وہ لیاقت اور عقل پیدا کریں جو بالفعل اہل فرنگ کو حاصل ہے۔ اب جو امید ہے کہ ایک دن اہل ہند عاقل اور عالی حوصلہ مثل فرنگیوں کے ہوجائیں اس باعث سے ہوتی ہے کہ علوم وفنون کی کتابیں زبان اردو میں ترجمہ کی جائیں اور اس کی وساطت سے ہند کے آدمی علم حاصل کریں۔"

ماسٹر رام چندر نے اردو کی مقبولیت کے بارے میں لکھا ہے:

> "واضح ہو کہ زبان اردو ایسی ہے کہ بہت دور سمجھی جاتی ہے......اور ظاہر ہے کہ وہی زبان بآسانی تحصیل ہوسکتی ہے، جس کے سمجھنے میں چنداں مشکل نہ ہو۔ اب غور کرکے دیکھو تو دریافت ہوگا کہ

حیدر آباد دکن سے لگا کے، سرحد نیپال اور دریائے اٹک تک اور شہر سورت (کذا) سے شہر پٹنہ تک زبان اردو یعنی وہ زبان جو دلی میں لوگ بولتے ہیں سمجھی جاتی ہے۔ سوائے اردو کے کوئی ایسی زبان ہندوستان میں نہیں ہے جس کا اس قدر زیادتی سے رواج ہو۔ پس اگر اس زبان کی وساطت سے علوم شیوع ہوں اور رواج پاویں تو حقیقت میں خلقت ہند کو بہت فائدہ ہے۔" (۱)

ماسٹر رامچندر کے ۱۸۴۷ء کے مذکورہ بیان کے بعد ۱۸۵۵ء میں مشہور انگریز ڈنکن فوربس Duncan Forbes نے A Grammar of Hindustani Language شائع کی۔ اس کے دیباچہ میں ڈنکن فوربس نے بھی ہندوستانی (اردو) کی عوامی مقبولیت کا ذکر کیا ہے اور آخر میں "اردو" کتاب "خرد افروز" کے اقتباسات کا بھی ذکر کرتا ہے، جو فوربس کی رائے کے مطابق اس کی اس قواعد میں شامل کیے گئے ہیں۔ بقول فاربس "اردو" کے اقتباسات سب سے آسان اور باوقار (easiest and most graceful) نمونے ہیں۔ زبان کی مقبولیت کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

"The following work has been compiled with a view to enable every one proceeding to India to acquire fair knowledge of the most useful and most extensively spoken language of the country. Of late years, a new area may be said to have commenced with regard to the study of the Hindustani language; it being now imperative on

(۱) بحوالہ: ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی: ہندوستانی نشاۃ ثانیہ میں قدیم دہلی کالج کا کردار۔ شاید پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۲، ص ۱۰۰۔۱۰۱۔

every junior officer in the Compay's service to pass an examination in that language before he can be deemed qualified to command a troop, or to hold any staff appointment. Such being the case, it is desirable that every facility should be afforded to young men destined for India to acquire at least an elementary knowledge of Hindustani in this country, so as to be able to prosecute the study during the voyage."

مذکورہ آرا صرف چند منتخب آرا ہیں جن سے اردو کے اصل زبان ہونے کے ثبوت ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بیسیوں ایسے حوالے ہیں جن سے جدید ہندی (دیوناگری) پر اردو کا زمانی تقدم ثابت ہوتا ہے۔ یہ آرا سماجی و علمی انصاف پسند علمائے زبان کی آرا ہیں جن میں جدید ہندی کے غیر مسلم عالموں کی اکثریت ہے، جنھوں نے مسلم نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ علمی نقطۂ نظر سے اردو اور ہندی کے مسئلہ پر غیر جانبدارانہ گفتگو کی ہے۔

☆......☆......☆

چوتھا باب

زبان اور بولی کے رشتے اور مسائل

زبان، خیالات اور جذبات کے اظہار کا نطقی وسیلہ ہے۔ لسانیات مطالعہ زبان کا علم ہے۔ ماضی میں زبانوں کی عہد بہ عہد ترقی کو ہی لسانیات یا علم زبان کہا جاتا تھا، جس کو آج ہم تاریخی لسانیات کہتے ہیں۔ ماضی میں اسے فیلولوجی (Philology) کہتے تھے، اردو کے ممتاز محقق شمس العلما محمد حسین آزاد نے جب 'سخندان پارس'' لکھی تو علم زبان کو فیلولوجی ہی لکھا ہے، لیکن اب یہ لفظ تاریخی لسانیات ہی کے لیے مختص ہے۔

زبان کے بنیادی عناصر میں صوتیات (Phonetics) صرف (Morphology) اور نحو (Syntax) ہیں۔ ایک ہی ارتقا پذیر زبان میں جغرافیہ، تاریخ اور سماج کی مناسبت سے تھوڑی بہت تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں تو انہیں ہم بولیاں (Dialects) کہتے ہیں۔ علم لسانیات کے مطابق ایک ہی زبان کے بولنے والے دو اشخاص کی زبان میں بھی فرق ہوتا ہے جسے idiolect یا انفرادی بولی کہتے ہیں۔ ہر زبان کا بولیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ لسانیات میں بولیوں کے مطالعے کو بولیات یا (Dialectology) کہتے ہیں۔ بولیاں جغرافیائی (Geographical Dialect) بھی ہوتی ہیں اور سماجی (Social Dialects) بھی ہوتی ہیں۔ زبان کو ایک ہی سطح پر نہیں بولا جاتا، اس کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ اعلیٰ (High) اور ادنیٰ (Low) سطحیں بھی ہوتی ہیں، جسے آپ ادبی، علمی زبان اور بول چال کی زبان (Colloquial) بھی کہتے ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی مزید سطحیں بھی ہوتی

[illegible]

ہیں۔ کلاس روم کی مدرسی کی زبان الگ ہوتی ہے۔ بے تکلف دوستوں میں یا گھر میں بولی جانے والی زبان الگ ہوتی ہے اور ہاٹ بازار میں بولی جانے والی الگ ہوتی ہے۔ جس میں معیاری زبان کی پابندی نہیں ہوتی اور اس کے صوتی لہجے اور قواعد اصولی بہت ڈھیلے ہوتے ہیں۔ ہماری بولیوں میں اردو کی حد تک بیگماتی اردو یا عورتوں کی اردو بہت اہم ہے جو اب آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے تاہم اس کے غیر محسوس اثرات باقی ہیں۔ ایک تصور بازاری زبان سلینگ (Slang) کا بھی ہے۔

ویسے بھی لسانی نقطۂ نظر سے تعلیم یافتہ لوگوں کی عام زبان، معیاری زبان ہوتی ہے جو مخصوص لسانی قواعد کی پابندی کرتی ہے، صوتی سطح پر بھی اور صرفی و نحوی سطح پر بھی۔ اس کے قواعد سے انحراف سے زبان ساقط المعیار ہو جاتی ہے اور بولیوں کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ زبان اور بولی میں ایک قریبی رشتہ قائم رہتا ہے۔ وہ آپس میں برسرِپیکار نہیں رہتیں۔ ان میں ایک دوستانہ فضا بنی رہتی ہے۔ یہ دوستانہ فضا آپسی افہام و تفہیم (Mutual intelligibility) ہے۔ معیاری زبان اور بولی میں فرق ہوتا ہے لیکن یہ فرق کیفیت اور کمیت کا فرق ہوتا ہے۔

زبان اور بولی کے آپسی رشتے کے تعلق سے ماہرین لسانیات کی چند آرا ملاحظہ فرمائیے:

زبان اور بولیوں کا یہ رشتہ ایک اوپری رشتہ ہے، لیکن زبان اور بولی کا چھپا ہوا، لسانی اصطلاح میں ایک Deep رشتہ ہے۔ لفظوں کے جس طرح سطحی معنی ہوتے ہیں اسی طرح اندرونی یا استعاراتی معنی بھی ہوتے ہیں۔ گرامر میں ساخت (Structure) کی اوپری ساخت (Surface Structure) یا نچلی ساخت (Deep Structure) ہوتی ہے، اسی طرح زبانوں اور بولیوں میں بھی یہ رشتے قائم رہتے ہیں۔ زبانوں اور بولیوں کے یہ رشتے سماجی لسانیات (Socio-Linguistics) اور اسلوبیات (Stylistics) سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا رشتہ زبان کی جمالیات سے بھی ہوتا ہے۔ زبانیں صرف توضیحی

لسانیات ہی کی پابند نہیں ہوتیں، بلکہ سماجی، تہذیبی، جمالیاتی اور اسلوبیاتی انداز نظر سے بھی پہچانی جاتی ہیں اور اس طرح اس کے سرحد امکانات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ زبانوں کے مطالعے جملوں کی ساخت ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کا مطالعہ تہذیبی اور سماجی سیاق میں بھی ہوتا ہے۔ زبانیں تہذیبی افق کے پار (Languages Accross Culture) بھی اپنی معنوی حیثیت رکھتی ہیں۔

گیان چند نے اردو اور ہندی کے رشتے کو بہت محدود معنوں میں رکھا ہے اور سماجی اور تہذیبی افق کو پوری طرح نظر انداز کرنے کی وجہ سے غلط نتائج اخذ کیے ہیں۔ زبان نہ ہوتی تو رسم الخط نہ ہوتا اور نہ ہی ادب ہوتا، (لوک ادب نہیں)۔ کسی بھی زبان کے تحریری ادب کے مطالعہ میں دونوں آنکھوں کی بینائی اور دونوں کانوں کی سماعی قوت لازمی ہے۔ تب کہیں کلی طور پر ان کا مطالعہ ہوسکتا ہے۔ جدید لسانیات (Modern Linguistics) کی عمر اندازاً سو (۱۰۰) سال کی ہے۔ سو سال میں لسانی علوم نے ارتقا کی گئی منزلیں طے کی ہیں۔ توضیحی لسانیات سے لے کر، تاریخی، سماجی، بشریاتی (Anthropological Linguistics) اسلوبیات (Stylistics) نفسیاتی (Psycholinguistics)، ریاضیاتی لسانیات (Mathematical Linguistics) اور کمپیوٹیشنل لسانیات (Computational Linguistics) وغیرہ بھی ہیں۔ زبان و ادب کے عام طالب علم کے لیے توضیحی لسانیات کے بعد سماجی لسانیات، بشری لسانیات اور اسلوبیات اور شعری لسانیات کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ ایک کل کے مختلف جز ہیں، ایک جز پکڑ کر کل کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو اندھے اور ہاتھی کی کہانی کے مصداق ہوگا۔ گیان چند کا اردو اور ہندی کا مطالعہ اسی نوعیت کا ہے۔ اردو اور ہندی اسی لحاظ سے الگ الگ ہوجاتی ہیں۔ میں نے اپنے مضمون "دو زبانیں اور دو رسم الخط: ہندی اور اردو کے تناظر میں" (مطبوعہ ہماری زبان، دلی، یکم اگست ۲۰۰۳ء) میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام ڈاکٹر گیان چند کے مکتوب مطبوعہ جون رجولائی ۲۰۰۳ء کے حوالے سے لکھا تھا اور اپنا نقطہ نظر پیش کیا تھا، میں نے اسی نوعیت کا مگر قدرے مختلف

مضمون ''اردو اور ہندی: تاریخی اور لسانی تناظر میں'' تقریباً پندرہ سال قبل لکھا تھا (دیکھئے ماحاصل (۱) لہٰذا اس کی تکرار سے میں صرف نظر کرتا ہوں۔

زبان اور بولیوں کے تاریخی رشتوں پر ماہرین لسانیات نے بحث کی ہے، چند بنیادی امور پر گزشتہ صفحات میں گفتگو ہو چکی ہے۔ گیان چند نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ سوال اٹھایا ہے کہ:

''کیا امتداد زمانہ کے ساتھ ایک زبان بٹ کر بولیوں میں تقسیم ہو گئی یا مختلف بولیاں مل جل کر زبا نیں بنیں یعنی بولیاں پہلے آئیں یا زبان''؟

اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے گیان چند نے لکھا ہے:

''ریناں اور میکس مولر کا خیال ہے کہ زبان کا فطری ارتقا انتشار سے اتحاد کی طرف ہے۔ ابتدا میں انسانی بولیاں متعدد ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ میل جول کے ساتھ ان کے اختلافات کم ہوتے گئے اور وہ ایک زبان کی شکل میں گتھ گئیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ابتدا میں قبیلے، ذات پات گوتر اور خاندان تھے جو بعد میں قوم کی شکل میں منظم ہو گئے۔ امریکی ماہر لسانیات وھٹنی اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کی رائے ہے کہ زبان پہلے آئی اور وہ آہستہ آہستہ بولیوں میں تقسیم ہو گئی۔ کچھ اور عرصے کے بعد یہ بولیاں خود زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور ان سے پھر بولیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایسی بدیہی بات ہے جس کے ثبوت کی ضرورت نہیں۔'' (۲)

---

(۱) پروفیسر عبدالستار دلوی: اردو زبان اور سماجی سیاق، قلم پبلی کیشنز، ممبئی ۱۹۹۳ء

یہ مقالہ پاکستان (کراچی) سے شائع ہونے والے جریدے ''ارتقا'' میں بھی شائع ہوا تھا۔

(۲) گیان چند نے یہ گفتگو مشہور ماہر لسانیات وھٹنی کی کتاب Language and the study of language کے حوالے سے کی ہے۔

ماہرین زبان میں زبان اور بولی کے رشتوں کے سلسلے میں یہ رائے ہے اور علمی مطالعوں کے سلسلے میں چاہے وہ تاریخی ہوں یا لسانی یا دوسرے علوم کے حوالے سے ہوں، اختلاف رائے کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔

لیکن رائے کے اختلاف کرنے میں سلیقہ، تہذیب اور شائستگی ضروری ہے۔

زبان کے فطری ارتقا کے انتشار سے اتحاد کی طرف مراجعت کرنے کی ایک مثال کی طرف میں نے اس کتاب میں اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ قدیم ہندوستانی زبانوں مثلاً اپ بھرنش، پراکرت وغیرہ کے تعلق سے کاکا صاحب کالیکر کا بھی یہی نظریہ ہے کہ پالی، پراکرت اور اپ بھرنشاؤں کی بھری ہوئی صورت نے منظم طریقے سے سنسکرت کو عظیم اتحاد میں سمو دیا، گویا سنسکرت زبان میں اپ بھرنشاؤں اور پراکرتوں کو ایک منظم لڑی میں پروکر اسے قواعدی اصولوں کا پابند کیا گیا۔ کاکا کالیکر نے لکھا ہے:

"It is rather curious that Sanskrit should have been called the Deva-bhasha or the language of gods when history show that it is the result of the concious efforts of the Aryans to free many orignal prakrit dialects into a polished speech. The very name sanskrit means polished speech; This is sufficient to prove that Sanskrit was something like a successful EXPERANTO in the hey - day of Aryan Culture." (1)

(1) Kaka Saheb Kalekar: The link of Sanskrit, in Affinity of indian Language- Page-30

جو بات کاکا صاحب کالیکر نے پراکرتوں اور سنسکرت کے بارے میں کہی ہے، ریہل اور میکس مولر کے خیالات بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ اردو اور ہندی و ہندوستانی کے تعلق سے یہ بات بعد میں زیر بحث آئے گی، لیکن ہم اس سے قبل ہندوستان کی ایک اہم زبان مراٹھی کے تعلق سے گفتگو کریں گے۔

مراٹھی ہند آریائی زبانوں میں بہت ممتاز زبان ہے۔ اس کا قدیم سنت ساہتیہ سنت گیانیشور (۱۲۷۵ء-۹۶) تا سنت امرت رائے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ یہ بھکتی اور تصوف کی شاعری کا ایک ملا جلا روپ ہے جس میں اسلامی تصوف اور بھکتی کے دھارے مل گئے ہیں۔ گیانیشور کی "گیانیشوری" سے لے کر ان کی بہن مکتا بائی، ایکناتھ، نام دیو، تکارام، رام داس اور امرت رائے جیسے متعدد صوفی سادھو پیدا ہوئے۔ جن کی شاعری میں تصوف اور بھکتی کا سنگم ہے۔ گیانیشوری کا آخری دعائیہ حصہ پسائدان (نذرانۂ عقیدت) کے نام سے مشہور ہے۔ پسائدان کے مضمون اور تعلیم پر سورۂ فاتحہ کا اثر ہے۔ یہ مراٹھی شاعری کا شاہکار ہے جو ایک معیاری زبان سمجھی جاتی ہے۔ بیسویں صدی عیسوی جدید مراٹھی ادب میں اپنے امتیازات رکھتی ہے۔ مراٹھی کی مختلف بولیوں میں پونہ کی مراٹھی معیاری زبان سمجھی جاتی ہے اور ودربھ، مراٹھواڑہ اور دیگر مراٹھی علاقوں کے لب و لہجے کو بہت زیادہ معیاری نہیں سمجھا جاتا۔ مراٹھی کی بولیوں میں کوکنی ایک اہم بولی ہے، جو کئی ذیلی بولیوں میں منقسم ہے۔ ڈاکٹر اے ایم گھاٹگے مراٹھی کو اصل زبان مانتے ہیں اور دیگر بعض محققین کوکنی کو مراٹھی کی بولیوں میں مانتے ہیں، لیکن اس کے برعکس مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر ایس ایم کترے (سابق ڈائریکٹر دکن کالج و اڈوانس انسٹی ٹیوٹ آف لنگوئسٹکس، پونے) اپنی کتاب The Formation of Kokani Language میں کوکنی کو اصل زبان مانتے ہیں اور مراٹھی کو کوکنی کی بولی سمجھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کوکنی مراٹھی کی ماں ہے، جبکہ اب مراٹھی ہی کو معیاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ ہمارے ہندوستان میں جو زبانوں کی بحث برپا ہے انتشار سے اتحاد کی

طرف مراجعت کی اس طرح کی دوسری مثالیں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ مطالعہ زبان کا ایک دلچسپ پہلو ہے۔

انگریزی ایک عالمی زبان ہے۔ انگلستان میں انگریزی نے مختلف بولیوں کو جنم دیا ہے، لندن معیاری انگریزی کا مرکز ہے۔ B.B.C کی انگریزی کو معیار تصور کیا جاتا ہے، جسے Received Pronunciation کہا جاتا ہے جس کا مخفف (R.P) ہے۔ یہ ادب اور شعر، انتظامیہ اور تجارت اور تعلیم و تدریس کی زبان ہے، لیکن شہر میں بولی جانے والی زبان کے لہجے الگ الگ ہیں۔ مشرقی لندن (East London) میں بولی جانے والی انگریزی کو Cockni Dialect کہا جاتا ہے، عام انگریزی داں کے لیے اس بولی کا سمجھنا مشکل ہے۔ معیاری انگریزی اور کوئی انگریزی میں افہام و تفہیم کے لیے کانوں کا مانوس ہونا ضروری ہے۔ آکسفورڈ انگلش کی اپنی حیثیت ہے لیکن ویلش (Welsh) اور سکاٹش (Scottish) انگلش کی بولیاں ہوتے ہوئے بھی زبانوں کے زمرے میں شامل ہیں۔ یہی حال آئرش (Irish)، آئر لینڈ کی زبان کا ہے۔ لہجے، لفظیات اور ادب نے انھیں زبان کی حیثیت عطا کی ہے۔ فرانسیسی، جرمن، ڈچ اور اطالوی ایک ہی زبان کے مختلف روپ تھے، لیکن اب ان میں لسانی اختلافات پیدا ہو جانے سے یہ ایک زبان نہیں چار مختلف زبانیں ہیں۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ چار ملکوں کی چار زبانیں ہیں اور سب کے ادب الگ الگ ہیں اور ان کے ارتقا کی تاریخ جدا جدا ہے۔ انگلستان کی انگریزی، امریکہ کی انگریزی، نیوزی لینڈ کی انگریزی اور ہندوستان و پاکستان کی انگریزی، ایک زبان ہونے کے باوجود الگ الگ بولیاں ہیں۔ جن کے اپنے ادب ہیں اور ان کی اپنی لسانی شناخت ہے۔ امریکہ کی انگریزی نے اپنے مرکز سے کوسوں دور پرورش پائی جو نسلاً ایک ہی ہے مگر اپنی انگریزی کو انگلش نہ کہتے ہوئے امریکی (American) اور ادب کو امریکی انگلش ادب کے بجائے امریکن ادب (American Literature) کہتے ہیں۔ فطری طور پر انسان اپنی لسانی، تہذیبی اور ادبی شناخت قائم رکھنا چاہتا ہے۔ زبانیں

بولیوں میں اور بولیاں زبانوں میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ یہ اپنی اپنی شناخت کے لیے ایک خاموش کشمکش سے گزرتی ہیں۔ کچھ زبانیں یا بولیاں منصوبہ بند طریقوں سے مذہبی شناخت اور سیاسی ضروریات کے تحت بنتی بھی ہیں اور تاریخ کے دبیز پردوں میں چھپ بھی جاتی ہیں۔ سنسکرت ایک عظیم زبان ہے جو بولیوں کے زیر اثر ایسی دب گئی کہ دو صدی قبل تک اس کا صرف نام باقی تھا، اسے حیات نو مستشرقین نے دی۔ عبرانی زبان ختم ہو رہی تھی مگر اسرائیلی نسل پرستی اور سیاسی عزم نے اسے زندہ کر دیا۔ عربی کا اپنا معیار ہے، لیکن بولیاں الگ الگ ہیں۔ عراقی، شامی اور فلسطینی عربی ادب ہونے کے باوجود اپنی اپنی آزادانہ شناخت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس مصری عربی، عربی نہ کہلاتے ہوئے مصری (Egyptian) کہلاتی ہے اور اس کا ادب مصری ادب (Egyptian Literature) کہلاتا ہے۔

گیان چند نے یہ صحیح لکھا ہے کہ کبھی کبھی زبان کے زوال پذیر ہونے پر وہ بولی کا درجہ اختیار کرتی ہے۔ اس سے قبل مراٹھی اور کونکنی کا ذکر ہوا ہے، اگر مراٹھی کو معیاری زبان تسلیم کیا جائے تو کونکنی اس کی علاقائی بولیاں ہیں اور اگر کونکنی کو اصل زبان مانا جائے تو اب وہ زوال پذیر ہو کر بولیوں میں بدل گئی ہے یا پھر اسی کونکنی سے معیاری مراٹھی کا روپ نکھر کر سامنے آیا ہے۔ جہاں تک برج اور اودھی کا سوال ہے عہد وسطیٰ میں وہ آزاد زبانیں تھیں اور ان کا ادب آزاد ادب تھا، مگر اب ان زبانوں کے زوال کے بعد، یہ دونوں زبانیں بولیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور یہ بولیاں برج اور اودھی ہی کی بولیاں ہیں۔ انہیں زوال کے بعد ہندی کی بولیاں کہنا، لسانی تحقیق کا اندھیر اور سیاسی ہیرے بازی ہے۔ یہی حال میتھلی اور راجستھانی کا بھی ہے۔ یہ دونوں زبانیں بھی آزاد زبانیں تھیں جو اب بولیوں میں بدل گئی ہیں۔ برج، اودھی اور میتھلی کے عظیم المرتبت شعرا میں ملک محمد جائسی، سورداس اور ودیاپتی کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ عظمت و بلندی آج تک ہندی کے کسی ایک بھی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ ہندی جو ۱۸۵۰ء کے بعد بنی اور جسے

ہر طرح کی سیاسی پشت پناہی حاصل رہی ابھی قدامت اور ادبی شناخت کی تلاش میں ہے، یہ وہی ادبی قدامت اور شناخت کی تلاش ہے جو کبھی برج، کبھی اودھی، کبھی میتھلی، کبھی بھوجپوری اور کبھی راجستھانی کو ہندی کہہ کر جڑیں تلاش کرتی رہتی ہے۔ قدامت اور شناخت کی تلاش جدید ہندی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اب کئی ہندی والے اردو کو بھی ہندی کی بولی یا اسلوب کہنے لگے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے موقع پر بمبئی میں الماللطیفی ہال (بائکلہ) ممبئی میں غالب صدی کا افتتاحی جلسہ تھا جس کی صدارت مشہور سکالر ڈاکٹر رفیق زکریا فرما رہے تھے۔ علی سردار جعفری اور دیگر حضرات کے ساتھ ہندی کے شاعر اور ناول نگار دھرم ویر بھارتی (جانفت روزہ دھرم یگ کے مدیر تھے) بھی وہاں موجود تھے اور کملیشور بھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دھرم ویر بھارتی نے اپنی تقریر میں کہا کہ "ہم غالب کو ہندی کا کوی مانتے ہیں اور اسی لیے وہ اس جلسے میں غالب کو شردھانجلی دینے کے لیے آئے ہیں"...... لوگ حیران تھے کہ غالب کا ایک شعر سمجھنے سے قاصر دھرم ویر بھارتی اب غالب کو ہندی کا شاعر مانتے ہیں۔ اس طرح کی گفتگو علمی نہیں، سیاسی گفتگو ہوتی ہے۔ جو سیاست دانوں کو تو زیب دیتی ہوگی مگر علم و ادب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے حد درجہ معیوب بات ہے۔

زبانوں کے ماضی بعید کے بارے میں بھی گیان چند نے اپنی کتاب کے پانچویں باب میں بحث کی ہے۔ یہ بحث کارآمد ہوتے ہوئے بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردو والوں کے تئیں ان کا رویہ تحقیر آمیز ہے۔ یہ دراصل ان کی عادت ثانیہ ہے۔ اس کے بغیر وہ لقمہ توڑ نہیں سکتے۔ جہاں تک تاریخی، لسانی بحثیں ہیں وہ مفید ہوتے ہوئے بھی جانبدارانہ ہیں۔ کشوری باجپئی کے حوالے سے یہ بات کہ "ہندی اور سنسکرت میں اختلاف کے باوجود مماثلت بھی ہے۔ یہ دونوں شاخیں ایک ہی اصل زبان کی فروع ہیں" یہ بات گہرے مطالعہ کی متقاضی ہے۔ یہ میرا موضوع نہیں ہے، تاہم ہندی اور سنسکرت کے تعلق سے جو امکانات یہاں بیان کیے گئے ہیں وہی تحقیقیں اردو ہندی کے بارے میں

بھی صحیح ہیں۔

زبانوں کے نام: زبانیں عہد بہ عہد ترقی کرتی ہیں، یہ ہزاروں سالوں کی ترقی کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ زبانوں کی عہد بہ عہد ترقی اور ان کے ناموں کو اور ان منزلوں کو سمجھنا، ایک مخصوص علم ہے جس کے لیے زبانوں کے ارتقا کی قدیم منزلوں کا جاننا ضروری ہے۔ یہ تاریخی لسانیات کے ماہرین ہی کا کام ہے، ان معاملات میں دخل در معقولات مناسب نہیں۔ لیکن جہاں تک جدید ہندوستانی زبانوں کے ناموں کا تعلق ہے برج، اودھی، بھوجپوری، راجستھانی وغیرہ اپنے اپنے علاقوں سے پہچانی جاتی ہیں اور یہ سب آزاد ترقی یافتہ زبانیں ہیں جن میں سے چند زبانوں کے دائرے سے نکل کر بولیاں بن گئی ہیں۔ اگر انہیں سیاسی پشت پناہی حاصل ہو تو عجب نہیں کہ وہ پھر عبرانی کی طرح زبانوں میں تبدیل ہو جائیں۔

برج بھاشا، کھڑی بولی سے قبل اپنے علاقہ کی ممتاز بول چال کی اور ادبی زبان تھی۔ از منہ وسطی میں ہندوستان ایک ملک نہیں تھا، مختلف آزاد مملکتوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر ملک کی اپنی زبان تھی۔ زبانیں اپنے علاقے سے پہچانی جاتی ہیں۔ کھڑی بولی اردو نے جب ترقی کی تو ملک دکن کے اعتبار سے وہ دکنی اور ملک گجرات کے اعتبار سے گجری، ہندوستانی کی مناسبت سے ہندوستانی رہندی کہلائی۔ یوں ہندی کا نام ساری ہندوستانی زبانوں کے لیے بھی مستعمل رہا ہے۔ بھاشا بھی ایک عام لفظ ہے جو زبان کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ برج دیس کی بھاشا کو برج بھاشا یا صرف بھاشا بھی کہتے تھے، دکن میں دکنی کو بھی بھاشا یا بھاکا کہا گیا ہے۔ اردو کے ابتدائی ناموں میں ہندی، ہندوی، ریختہ، زبان دہلوی، زبان اردوئے معلی، ہندوستانی اور اردو مترادفات کے طور پر رائج رہے ہیں۔ اردو، ہندی اور ہندوستانی بعد میں زیادہ مستعمل رہے۔ ریختہ، اردو اور ہندی غالب کے عہد تک ایک ہی زبان کے تین نام ہیں۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب کے مکاتب کے دو مجموعوں کے نام "اردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" ہیں۔ یہ لفظ ہندی (بمعنی اردو) دیگر شعرا کے یہاں بھی مستعمل تھا۔ اردو کے لیے ریختہ کا لفظ بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا شبلی نے بھی استعمال کیا ہے۔ شبلی کی ایک غزل کا شعر ہے۔

یہ نظم آئیں، یہ طرز بندش، سخن وری کیا فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی ہے طرز علی حزیں کا

ہندوستان میں اردو اور ہندی میں جو مماثلت ہے، اتنی مماثلت ہندوستان کی بہت کم زبانوں میں ہے۔ دراوڑی خاندان کی زبانوں میں بھی اس طرح کی مماثلتیں ہیں۔ یورپ میں فرانسیسی، جرمن، اطالوی، ہسپانی زبانوں میں بھی اردو ہندی کی طرح کی مماثلتیں ہیں، لیکن ان مماثلتوں کی وجہ سے انہیں کوئی ایک نہیں سمجھا جاتا۔ وہ آزاد زبانیں ہیں اور ان کا ادب الگ الگ ہے۔ جملوں میں الفاظ کی نشست و برخاست کی جگہ متعین رہنے سے ہی ایک کو دوسری میں مدغم سمجھنے کا رویہ غلط ہے۔ جملے کی ساخت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جو زبانوں کو ایک کو دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ ساخت (Structure) کے اعتبار سے جو مماثلت اردو اور ہندی میں ہے اسی طرح کی مماثلت مراٹھی، گجراتی اور دوسری ہند آریائی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

ذیل کے جملے دیکھیے:

اردو: میں جا رہا ہوں		اردو: گیندے کے پھول بہت خوبصورت ہوتے ہیں

ہندی: میں جا رہا ہوں		ہندی: گیندے کے پشپ اتی سندر ہوتے ہیں

مراٹھی: می ذات آہے		مراٹھی: جھینڈوچے پھول فار سندر دستات

گجراتی: ہوں جاؤں چھوں گجراتی: تمھینڈو ونی پشپو بہو سندر لاگیچھ

☆

اردو: آپ کا مبارک نام کیا ہے

ہندی: آپ کا شبھ نام کیا ہے

مراٹھی: آپلے شبھ ناؤں کائے آ ہے

گجراتی: آپنو شبھ ناؤں سوں چھے

مذکورہ چاروں زبانوں کی قواعدی ساخت ایک ہے، مگر یہ چاروں زبانیں الگ ہیں بشمول مراٹھی و گجراتی کے۔

اردو اور ہندی میں ایک واضح فرق ان زبانوں کی معیار بندی اور محاوراتی زبان ہونے کا بھی ہے۔ ہندی کے مشہور شاعر رام نریش ترپاٹھی نے ایک موقع پر گاندھی جی سے کہا تھا:

''کہ اگر وہ (گاندھی جی) ہندی اور اردو کے میل سے بچی ہندوستانی کی امید رکھتے ہوں تو انہیں (گاندھی جی کو) اردو سے زیادہ مدد ملے گی، شرط یہ ہے کہ اردو کو نیا جامہ پہنا کر بگاڑنے کی جو کوشش ہو رہی ہے اسے میں اسی طرح سمجھ لوں، جس طرح ہندی کو بگاڑنے کی کوشش کو سمجھتا ہوں۔''

اس سلسلے میں گاندھی جی نے تحریری طور پر وضاحت چاہی تو رام نریش ترپاٹھی جی نے گاندھی جی کو اپنے خط میں لکھا:

''ہندی اور اردو کے ڈھانچے کا فرق آپ نے مانگا تھا، پر ڈھانچا تو مجھے جانا بوجھا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی کوئی الگ روپ ریکھا کھینچ کر نہیں دکھا سکتا ہوں۔ ہاں ایک سجھاؤ دے سکتا ہوں، ہر یجن کے کسی ایک پیراگراف کا انوواد ہندی اور اردو کے دو لائق لیکھکوں

سے کرا کر دیکھ لیجئے۔ ڈھانچے کا فرق دکھائی پڑنے لگے گا۔ میں نے اس دن کہا تھا کہ اردو ہندی سے منجھی ہوئی ہے۔ اس کی ایک مثال لکھتا ہوں۔ ہندی کے ایک مشہور لیکھک کا یہ فقرہ ہے: ''سمجھ میں نہ آنے سے گھبراہٹ سی لگنے لگتی ہے''۔ اردو میں گھبراہٹ لگتی نہیں، ہوتی یا پیدا ہوتی ہے۔ اردو کا کوئی مشہور لیکھک کبھی کوئی غلط محاورہ نہیں لکھے گا۔ اور اگر لکھ دے گا تو اسے زبردست مورچہ لینا پڑے گا۔ ہندی میں بھاشا کا اندولن ہی نہیں ہے، کوئی تحریک قائم کرنے کی بجائے اردو بھاشا کی کتابیں یا لیکھ ہندی شبدوں میں چھپنے لگیں تو ہندی بھاشا کا بھلا ہوگا۔ اردو بھاشا کے سدھارنے اور سنوارنے میں اردو شاعروں اور لیکھکوں نے پچھلے کئی سو برسوں میں جو کوشش کی ہے اس کا فائدہ ہندی بھاشا کو جلد ہی مل جائے گا اور اس طریقے سے وہ آپ سے آپ ہندوستانی بن بھی جائے گی۔'' (۱)

''ایک دوسرے ہندی بھاشا پریمی نے مجھے یہ بتایا ہے کہ اردو میں بھاشا پر جو محنت ہوئی ہے وہ ہندی میں شاید ہی ہوئی ہو۔ اب اگر ہم دونوں کھینچا تانی میں نہ پڑیں اور سمجھ لیں کہ دونوں بھاشاؤں کی جڑ ایک ہی ہے اور جسے کروڑوں دیہاتی بولتے ہیں، اس کے لیے عالموں اور شاعروں کو محنت کرنی ہے تو ہم جلدی سے آگے کوچ کر سکتے ہیں۔'' (۲)

---

(۱) ہریجن سیوک۔ ۱۴ جولائی ۱۹۳۶ء، بحوالہ: مشترکہ زبان، مہاتما جی نے کیا سوچا تھا۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ص ۱۶۹۔۱۷۰

(۲) ایضاً ص ۱۷۱

مذکورہ مشاہدات لسانی اعتبار سے بنیادی نوعیت کے حامل ہیں۔ محاورہ زبان میں ایک بنیادی قدر ہے۔ اس سے زبانوں کی سلاست اور روانی قائم رہتی ہے اور ان کا جمال اور حسن نکھر آتا ہے۔ بقول فراق:

ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، زبان میں محاورہ اور ضرب الامثال کی اہمیت وصل محبوب سے کم نہیں ہے، زبان کی سرسبزی اور شادابی کی یہ جان ہوتے ہیں...... دوسری اہم بات یہ ہے کہ زبانیں جنگل کی گھاس کی طرح اگتی ہیں۔ جس طرح اس گھاس کو تراش خراش کر گلستان میں تبدیل کیا جاتا ہے، کیاریاں بنائی جاتی ہیں، متوازن انداز سے اسے پھولوں سے سجایا جاتا ہے، اسی طرح کی صورت حال ترقی یافتہ اور اعلیٰ زبانوں میں بھی پیش آتی ہے۔ زبانوں کو بھی منظم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آوازوں، لفظوں، محاوروں، ضرب الامثال، قواعدی ساخت، نئے الفاظ کی ضرورت اور اہمیت کے احساس کے ساتھ اسے منظم کرنا زبان کی ترقی کا راز ہے۔ اسے جدید لسانی اصطلاح میں لسانی منصوبہ بندی یا Language Planning کہا جاتا ہے اور اردو زبان کی اپنی لسانیاتی جمالیات میں اصلاحی تحریکوں کا بہت عمل دخل رہا ہے۔ لکھنؤ اور دلی کی اصلاحی تحریریں ہوں یا سرسید کی اصلاحی تحریک، اردو زبان نے ان سے فیض اٹھایا ہے۔ اردو کی لفظیات یا عربی فارسی کے صرفی و نحوی اثرات کو تنقید کا نشانہ بنانے سے قبل اس لسانی اصلاح پسندی یا Language Planning کا ادراک اور شعور ضروری ہے۔ اردو کے حق میں رام نریش ترپاٹھی اور مہاتما گاندھی کے کلمات خیر کو اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ ہندی میں اس طرح کی اصلاحیں یا اصلاحی تحریکیں نہیں اٹھیں، اسے جنگل کی خود رو گھاس ہی کی طرح اگنے دیا گیا۔ جنگل کی گھاس اور پھولوں کا اپنا حسن ہے، وہ بھی مسرت بخش اور سرور انگیز ہوتے ہیں، لیکن بھرے پورے منصوبہ بند گلستان کے مقابلہ

میں اس کا حسن محدود ہوتا ہے۔ ہندی میں لسانی اصلاحی تحریکیں نہ ہونے سے اس زبان میں وہ وسعت پیدا نہ ہو سکی جو اردو میں ہے۔ اس سیاق میں آپ دیکھیں تو اردو کا مزاج تنگ نظری نہیں بلکہ وسیع القلبی اور وسیع النظری سے عبارت ہے۔ ہمیں پیچھے کی طرف ضرور دیکھنا چاہیے۔ تاہم آگے کے راستوں کو اپنی تنگ نظری کی وجہ سے مسدود نہیں کرنا چاہیے۔ اردو ہندی کے مقابلہ میں مسلسل ارتقا پذیر ہے، اس نے سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش سے بھی استفادہ کیا اور فارسی اور عربی سے بھی طاقت و توانائی حاصل کی اور اب انگریزی سے بھی شعور و ادراک کے ساتھ لفظ و معنی کی نئی نئی دنیائیں آباد کر رہی ہے۔ اردو کی یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ اور اثرات کو بہت جلد جذب کر لیتی ہے اور وہ لفظ اور وہ اثرات اردو کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دخیل الفاظ جب زبان میں شامل ہو کر جذب ہو جاتے ہیں تو وہ پرائے نہیں رہتے، اپنے بن جاتے ہیں۔ فلسفہ زبان کا یہ بنیادی اصول ہے اردو نے ہندی کے مقابلہ میں اس اصول کی ہمیشہ پابندی کی ہے۔ گیان چند صاحب کی چشم حسود میں علم زبان کی یہ بنیادی باتیں سما نہیں سکیں اور وہ اردو میں فارسی عربی کے اثرات کو غلط انداز نظروں سے دیکھنے لگے۔ مشہور امریکی ماہر لسانیات مارٹن جوس (Martin Joos) نے دخیل یا مستعار الفاظ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان الفاظ کو مستعار نہیں، صرف الفاظ سمجھ کر ہی ان کا استعمال کرنا چاہیے:

> "The question, how to treat loan words can have only one answer treat them as words". (1)

مولانا خواجہ محمد عبدالروف عشرت لکھنوی نے اردو زبان کی تعریف کرتے ہوئے اپنی کتاب ''زبان دانی'' میں لکھا ہے:

(1) Studies in Colloquial Japanese edited Martin Joos. 1957. Page 239

"اردو زبان کو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اگر کچھ ناز و فخر ہے تو اس سبب سے ہے کہ ایک مبسوط زبان سنسکرت کی نسل سے ہے۔ پہلے سنسکرت تحریف و ترمیم ہو کر بھاکا کے نام سے پکاری گئی۔ اس وقت ہندوستان کے صوبے صوبے کی زبان الگ الگ تھی۔ مرہٹی، گجراتی، بنگالی، پنجابی، کشمیری، پہاڑی اور خدا جانے کیا کیا نام تھے اپنی برادری میں شامل کیا اور یہاں تک ترقی کی کہ اسے عوام سے عام تک بولنے لگے۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ بھاکا کے ٹھیٹ الفاظ لوگوں کو ثقیل معلوم ہونے لگے۔ حروف روابط نے دوسری صورت اختیار کی۔ مصدروں، اور صیغوں نے نیا لباس پہنا۔ اسما نے تبدیل ہیئت کی تو اس کی پلٹ نے ایک دوسرا نام اختیار کیا اور لوگ اس کو پہلے ہندی، پھر اردو پکارنے لگے۔ بھاکا کا خوان نعمت اس وسیع زبان کا پیٹ نہ بھر سکا، تو بضرورت اسما دوسری زبانوں سے بھی لیے گئے اور عربی، فارسی، ترکی، انگریزی الفاظ کچھ تو تبدیل اور تعلیل کے بعد ملائے گئے اور کچھ بجنسہ داخل ہو گئے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ہم کو بھاکا کے فصیح الفاظ تنافر اور غرابت سے خالی ملیں دوسری زبانوں کا احسان نہ اٹھانا چاہیے، کیونکہ اس میں زیادہ فصاحت آتی ہے اور ہندوستان کے لیے بھی مفید ہے"۔(۱)

مولانا عبدالروف عشرت لکھنوی نے اپنے رسالے "جان اردو" میں، اردو، ہندی کی تعریف کرتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے:

(۱) رسالہ زبان دانی از مولانا خواجہ محمد عبدالروف عشرت لکھنوی مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنو جنبر ۱۹۱۹ء ص ۳۰۲

''اردو ہندی دو الگ الگ زبانیں نہیں ہیں حقیقت میں ایک زبان کے دو نام رکھ لیے ہیں۔ سنسکرت زبان تقلیل، اور تحریف کے بعد بھاکا بنی، بھاکا ترمیم، تنسیخ تقلیل کے بعد ایک دوسری زبان بنی جس کو اردو کہو یا ہندی۔ اردو کا نام ہماری زبان پر ابھی چند برسوں سے آگیا ورنہ ہندو تو ہندو، مسلمان بھی اس زبان کو ہندی کہتے تھے۔ چند عبارتیں ہمارے دعوے کی گواہ ہیں۔ قیامت نامہ کا مصنف کہتا ہے:

''بموجب فرمانے ان کے اس حقیر نے ۱۲۵۶ھ میں زبان ہندی میں ترجمہ کیا''۔

''نورنامے'' کا مصنف کہتا ہے:

اگرچہ تھی افصح و عربی زباں | سمجھ اس کی ہر اک کو تھی
سمجھ اس کی ہر اک کو دشوار تھی | کہ ہندی زباں یاں تو درکار تھی
اسی کے سبب میں نے کر فکر غور | لکھا نورنامے کو ہندی کے طور

اس سے معلوم ہوا کہ آج سے پچھتر برس پیشتر اسی زبان کو جسے ہم اردو کہتے ہیں سارے مسلمان ہندی کہتے تھے، رفتہ رفتہ کچھ لوگوں نے اسے اردو کہنا شروع کیا''۔(۱)

زبان کے معنوں میں ''اردو'' کا لفظ مصحفی نے استعمال کیا تھا۔ میرے بزرگ اور کرم فرما مشہور مورخ اور غالب و اقبال کے مراٹھی مترجم پنڈت سیتو مادھوراؤ پگڑی نے مجھے ایک مرتبہ بتایا کہ مصحفی سے قبل ''اردو'' کا لفظ زبان کے معنوں میں سورت فیکٹری دستاویزات (Surat Factory Records) میں بھی استعمال ہوا ہے۔(۲)

گیان چند کی فارسی الفاظ کے تعلق سے درپردہ جو شکایت ہے وہ اس لحاظ سے بے معنی ہے کہ فارسی الفاظ سے نہ صرف یہ کہ اردو میں فصاحت و بلاغت اور وسعت پیدا

(۱) خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی: جان اردو مطبوعہ نول کشور پریس لکھنو ۱۹۲۰ء ص ۳

(۲) پگڑی صاحب نے اس سلسلے میں مزید حوالہ بھی دیا تھا، مگر میری بدتوفیقی کہ میں اسے محفوظ نہیں رکھ سکا۔

ہوئی بلکہ ہندی نے بھی صرف نحو اور لفظیات کی سطح پر فیض اٹھایا۔ امبیکا پرساد واجپئی نے اپنی کتاب پرشین انفلوئنس آن ہندی میں ہندی پر فارسی اثرات کا مفصل ذکر کیا ہے جس سے ہندی نے توانائی حاصل کی ہے۔ واجپئی نے اپنی کتاب کے اختتامیے میں، اردو اور ہندی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "In concluding this survey it is necessaryy to observe that Urdu has been the spoken and literary language of the Indian musalmans for nearly three hundred years and more, but Hindi has not completed even two hundred years of its life as a literary language, though as a spoken language it is older than Urdu. This is the reason why Urdu poetry captivates the heast of its hearers and modern Hindi poetry is not fascinating and elegant to that extent. The Hindi of saiyad Insha Allah Khan as seen in the "Rani Ketaki - ki- Kahani" "is yet surpassed." (1)

واجپئی جی سے یہاں تھوڑے سے اختلاف کی گنجائش یہ نکلتی ہے کہ بول چال کی ہندی کی عمر اردو سے قدیم نہیں ہے، بول چال کی زبان جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے وہ برج اور اودھی زبانیں تھیں ہندی نہیں۔ اسی طرح رانی کیتکی کی کہانی بھی اصلاً اردو ہے، اسلوبیاتی اعتبار سے بھی اردو رسم الخط کے اعتبار سے بھی لیکن خوشی کی

(1) Ambikaprasad Vajpai: Persian Influence on Hindi, University of Calcutta (1935) Page 101,102

بات ہے کہ ضرورتاً اس سے اہل ہندی بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اردو اور ہندی میں اس طرح کا لین دین دونوں زبانوں کے لیے مفید ہے۔ اردو اور ہندی کو ایک دوسرے کا حلیف ہونا ہے نہ کہ حریف۔ "رانی کیتکی کی کہانی" اردو اور ہندی کو جوڑتی ہے۔

واڈیا جی اپنے اقتباس میں پھر لکھتے ہیں:

"Hindi writers who wish to master the art of writing must go through a course of Urdu, because some master minds have laboured to make it what it is today. The reason for the difference between Lucknow and Delhi Schools of Urdu is that they mean business. The invent new forms, new idioms, and new meanings of words and some times they are accepted by the opposite school. Unless one studies Urdu, he can not be a master of Hindi as he will not be able to know the various stages through which it has passed" (1)

گاندھی جی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں ہندوستانی (مشکل سنسکرت اور مشکل عربی فارسی الفاظ کے بغیر) کو قومی زبان کی حیثیت سے رواج دینا چاہتے تھے۔ اپنے ہندوستانی کے تصور کے تحت انہوں نے ہندوستانی پرچار سبھائیں قائم کیں۔ جنوبی ہندوستان میں "دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا" کا قیام بھی اسی مقصد کے تحت کیا گیا تھا، لیکن اہل ہندی نے اردو رسم الخط ہی نہیں بلکہ عام فہم اردو الفاظ کے خلاف مہم چلائی۔

(1) A.R.Wadia: the Future of English in India, Asia Publishing House-Mumbai-1954 P.34.

ہندی، اردو کا سہارا لیے بغیر آزادانہ طور پر اپنی شناخت قائم کرنا چاہتی تھی۔ آج مجموعی طور پر اردو الفاظ کے ساتھ ہندی کا یہی رویہ ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہندوستان (اور اب پاکستان) سے بھی اس کی شناخت ہے۔ اس کی بنیاد ہندوستانی صرف ونحو ہے، اور اگر یہ عربی فارسی لفظ زیادہ استعمال کرتی ہے تو اس کی ذمہ داری بھی مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی ہے۔ آج بھی کثیر اردو الفاظ ہندی میں استعمال ہو رہے ہیں جن کی اصل عربی اور فارسی ہے، لیکن ہندی کے خالصیت پسند پنڈت ایسے الفاظ کو ہندی سے خارج کرنے اور ان کی جگہ مشکل سنسکرت الفاظ استعمال کرنے میں فخر اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بقول پروفیسر واڈیا اسے لسانی غنڈہ گردی (Linguistic Vandalism) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ رویہ ہندی کو کمزور کر رہا ہے۔ گاندھی جی کی ہندوستان کی تجویز ایک بالغ نظر سیاسی تجویز تھی، جس میں "ہندوستانی" کے فروغ کے ساتھ اس کی پالنے والی بھاشائیں یعنی اردو اور ہندی بھی ادبی زبانوں کی حیثیت سے فروغ پاسکتی تھیں۔ گاندھی جی کے ہندوستانی کے نظریے کو اردو اور ہندی کے لیے ایک مجموعی نام (Cover Term) کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ گاندھی جی نے اردو اور ہندی سے اجتناب نہیں کیا بلکہ انہیں دو ادبی اسالیب اور ہندوستانی کی پالنے والی بھاشائیں (زبانیں) کہا ہے۔ جہاں تک اردو اور ہندی سے ہٹ کر "ہندوستانی" کا سوال ہے، جو گاندھی جی کے بقول ایک اردو ہندی ملی جلی زبان ہے (اردو + ہندی = ہندوستانی)، ادبی اعتبار سے بھی اس کی اپنی حیثیت تھی اور آج بھی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی شاعری ہندوستانی کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ گاندھی جی خود حالی کی نظموں مثلاً مناجات بیوہ وغیرہ کو ہندوستانی کا نمونہ سمجھتے تھے۔ اقبال کے ترانہ ہندی کو بھی وہ اپنے تصور ہندوستانی کی عمدہ مثال تصور کرتے تھے۔

میں نے اپنی ترتیب دی ہوئی کتاب "امرت بانی" میں قدیم سے تا حال اردو اور

ہندی شاعری سے جس میں ہندوستان اور پاکستان کے شاعر شامل ہیں، گاندھیائی تصور ہندوستانی کے شعری نمونے پیش کیے ہیں۔(۱) ایک نثری انتخاب بھی کیا تھا، جو شائع نہیں ہوا۔ انشاء کی رانی کیتکی کی کہانی، اگرچہ اس کا اسلوب اور رسم الخط اردو ہے، ہندوستانی کا نمونہ ہے۔ گاندھی جی اور ان کے رفقا جیسے پنڈت نہرو، مولانا آزاد، سردار پٹیل اور ممتاز دانشور جیسے ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر ذاکر حسین، آصف علی، پنڈت کیفی کے بعد "ہندوستانی" کے نظریہ کو کسی کی تائید حاصل نہیں ہوئی اور ہندی کے حق میں اردو کی مخالفتیں بڑھتی گئیں اور پھر ہندی کو راج سنگھاسن پر بٹھایا گیا اور دستور ہند میں ہندی کو سرکاری زبان کا مقام حاصل ہونے کے باوجود یہ تنازعہ ختم نہیں ہوا۔ اس تنازعہ میں بطور خاص اردو کو اور ہندوستان کے لسانی منظر نامہ سے اردو کے اثرات کو ختم کرنے کی کوششیں جاری رہیں، جس میں پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنا نند اور اتر پردیش کی ہندی قومیت کی تحریک کا ہاتھ رہا ہے۔ اس نفرت انگیز ذہنیت میں جو فرقہ پسندی کا شاخسانہ تھی اردو کو ختم کر کے یا اسے صرف ہندی کا اسلوب کہہ کے پس منظر میں ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر گیان چند کی "ایک بھاشا: دو لکھاوٹ اور دو ادب" اس کی تازہ ترین اور نادر مثال ہے، کہ یہ کسی سیاست دان کا کارنامہ نہیں ہے، بلکہ ایک ایسے شخص کا کارنامہ جسے خود "اردو" نے عزت و احترام اور عظمت و بزرگی عطا کی تھی اور اردو ہی جن کی شناخت رہی ہے۔ توضیحی لسانیات کا حوالہ دے کر جو لسانیات کی وسیع و عریض دنیا کا پہلا زینہ ہے، اردو کے شاندار محل سے انکار اور اس میں دراڑیں ڈالنے کی یہ مذموم اور غیر علمی کوشش ہے۔ اردو اور ہندی کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے۔ پروفیسر اے۔ آر۔ واڈیا نے لکھا ہے:

---

(۱) عبدالستار دلوی، مرتبہ امرت بانی۔ مطبوعہ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر، ممبئی ۱۹۷۶ء

"Unfortunately the ghost of linguistic controversy has not been laid to rest by the declaration of the Constitution. There i the King's English or Oxford English as distinguished from the several dialects of English. Then there is American English which is fast developing into a language with its own peculiar characteristics of pronunciation and accent. There is more than a joke implied in the remark of an Indian husband of an American lady that he speaks English, but his wife speaks American. Similarly, the Hindi of Uttar Pradesh claims to be the genuine brand of Hindi, the Khari Boli (the true or correct language). In its loyalty to Sanskrit it has developed an unhealthy desire to eschew words of Persian and Arabic origin, even though they may have become part and parcel of Urdu as the lingua franca of the millions all over India. So dispassionate a student of Indian languages as Sir George Grierson notes how modern Hindi first grew as the Hindu counterpart of Urduu and tended to evolve as an "artificial

product" as contrasted with the natural growth of Urdu, which grew on Indian foundations but enriched itself by importing words of Persian and Arabic origin, which have come so acclimatised in India that their foreign origin is forgotten and requires a philosogist to trace the foreign ancestry of thousands of such Indian words. Any attempt to eschew such words smacks only of linguistic pedantry and political immaturity. No Englishman would go out of his way to seek out words just of Anglo - Saxon origin and avoid words of Latin and Greek origin, and even French and German origin, though the English have fought against the French and the Germans all over the world at the dictates of political exigencies. In fact the vary richness of English language is entirely due to an unrestrained borrowing of foreign words and only thus can a language live and grow. And yet an artificial loyalty to Sanskrit, coupled with a conscious antipathy to anything Muslim, has made modern Hindi as well as some other Indian

> languages so artificial and unintelligible. No wonder if even Gricrsion is constrained to say: "Modern Hindi prose is often disfigured by that too free borrowing of Sanskrit words instead of using home-born tadbhavas, which has been the ruin of Bengali, and it is rapidly becoming a Hindu counterpart of the Persianised Urdu, neither of which is intelligible except to persons of high education." (1)

اردو کے خلاف ہندی کے چاہنے والوں کا رویہ معاندانہ اور جارحانہ رہا ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں شدت پسندی پیدا ہوگئی۔ ڈاکٹر گیان چند اور ان کے ہمنوا ملک کی تقسیم کی ذمہ داری اردو کے سر ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اردو تقسیم ہند کی زبان ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں یا دانستہ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ کھڑی بولی اردو کا ارتقا پہلے ہوا۔ یہ زبان پہلے پھلی پھولی اور عوامی زبان کی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں اردو رسم الخط میں لکھی جانے لگی اور رابطہ عامہ Mass Communication کی زبان یا لنگوا فرانکا بنی اور جدید ہندی کا بعد میں اردو کے خلاف جوابا مصنوعی طریقے پر ہندوؤں کی تہذیبی و مذہبی زبان کے طور پر ارتقا ہوا۔ منطقی طور پر جو زبان، اصل زبان (اردو) کے خلاف ردعمل کے طور پر بنائی گئی، تقسیم ملک کی ذمہ دار وہی ہوگی لہٰذا اردو کی تقسیم ہند کا ذمہ دار قرار دینا انصاف اور عقل کے منافی ہے اور تاریخی اعتبار سے بھی غلط ہے۔ بقول پروفیسر واڈیا:

(1) A.R.Wadia: The Future of English in India - Asia Publishing House, Bombay. 1954 Pages 35-38

"The hostility of Hindi patriots against Urdu played its part in fanning Muslim fanaticism, which had its final fulfilment in the brith of Pakistan. This has automatically done away with one aspect of the battle. Urdu has become the official language of Pakistan. It is something that this has been done as nothing can affect the Indian origin of Urdu and Pakistan partiotism has not gone to the length of repudiating Urdu because of its Indian origin. With its supremacy in Pakistan its case in India has been considerably weakened." (1)

سنسکرت آمیز ہندی کو جو ناقابل فہم ہے "رگھو ویر ہندی" بھی کہتے ہیں، جس میں آسان باتوں کے لیے مشکل ترین الفاظ وضع کیے گئے ہیں جن کی ادائگی اعضائے نطق کے لیے ناممکن (Jawbreaking) بن گئی ہے۔ جدید ہندی سرکاری ٹکسال میں ڈھلی، بے معنی زبان ہے، جس کا سمجھنا ناممکن ہے۔ نہ اس میں سادگی ہے نہ صفائی ہے، نہ تازگی وشادابی ہے نہ خوشبو ہے اور جو صرف کتابوں میں محفوظ ہے۔ عوام کے دلوں کی دھڑکنیں اور جذبات کی گرمی اور فہم وفراست کی فراوانی اس میں معدوم ہے۔ اس کا عوام اور عوامی زندگی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ آج سے غالباً دو سال قبل Times of India, Mumbai کی رپورٹ کے مطابق دلی کے سکولوں کے بچوں نے اس مصنوعی ہندی کے خلاف احتجاج کیا تھا اور کہا تھا کہ جو ہندی ہمیں اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے وہ ہماری سمجھ سے بالاتر

(1) A.R.Wadia: The Future of English in India - Asia Publishing House, Bombay, 1954 P.42

ہے۔ اس زبان کا عام بول چال کی ہندی سے کوئی تعلق نہیں ہے، لہٰذا ہم یہ زبان پڑھنا نہیں چاہتے۔ ہندی اور اردو کا مسئلہ جب زیر گفتگو ہو تو سچ بولنا ایک مشکل آزمائش سے گزرنے کا عمل ہوتا ہے، اس لیے کہ عام بول چال کی زبان اگر آپ اسے ہندوستانی بھی کہیں تو وہ "اردو" ہی ہوتی ہے۔ میں نے ہندی کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھائی جانے والی کتابیں دیکھی ہیں اور ان میں مشکل الفاظ کے معنی بھی دیکھے ہیں۔ مثلاً سندھیا یعنی شام، اوشا یعنی صبح یا سویرا، پشپ یعنی پھول وغیرہ۔ ہندی الفاظ کی یہ فہرست طویل بھی ہو سکتی ہے۔ "رگھوویر ہندی" تو اس قدر لاجواب ہے کہ اس کا استعمال فہم و فراست سے بعید ہے۔ اس طرح کی اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں بنانے کی کوشش کی گئی تھی جیسے واٹر شیڈ (Water - Shed) کے لیے "فارق الماء" اس کا فارسی متبادل "فیصل آب" بھی ہو سکتا تھا جو نسبتاً آسان ہے، تاہم وہ غیر مانوس ہی رہا۔ اس کے لیے آسان لفظ پنڈھال ہو سکتا تھا جو عام فہم ہے۔ تھرمامیٹر کے لیے مقیاس الحرارت، ریڈیو کے لیے لاسلکی، یونیورسٹی کے لیے جامعہ، کالج کے لیے کلیہ جیسے الفاظ وضع کیے گئے تھے۔ اردو بولنے والے عوام نے ان الفاظ کو جو غیر فطری تھے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور تہذیبی اور سائنسی و علمی الفاظ کو اپنے ماخذ سے لینے کو ترجیح دی۔ اب تھرمامیٹر، ریڈیو، ٹیلی فون، یونیورسٹی، کالج، پرنسپل، پروفیسر، رجسٹرار اور اس نوعیت کے کثیر انگریزی الفاظ اردو زبان کا جز ہیں اور ان کے نعم البدل تلاش کرنے میں ذہنی کرتب نہیں دکھائے جاتے۔ اردو کا مزاج انجذاب کا مزاج ہے وہ فارسی، عربی، سنسکرت، ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کو اگر وہ زبان کی قواعدی ساخت (Grammatical Stucture) کا ساتھ دیتے ہوں تو آسانی سے اپنا لیتی ہے۔ وہ ترجمہ کی بجائے معنیاتی افق (Semantic Horizons) کو اہمیت دیتی ہے تاکہ لفظ یا اصطلاح سے متعلق معنی اور مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے اور اظہار کی قوت میں خلل پیدا نہ ہو۔ ایسی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ہندی اس کے برعکس سنسکرت الاصل الفاظ کے

استعمال پر زور دیتی ہے۔

طشتری اور رکابی کافی مقبول مانوس اور عام فہم لفظ ہیں۔ تام بمبئی کے سابق گورنر سرگرجا شنکر باجپئی نے اپنی ایک تقریر میں ہندی والوں کی رہبری کے لیے جو رگھوویری ہندی لکھتے اور بولتے ہیں، ایک واقعہ سنایا۔ دو انگریز افسر اپنی اردو دانی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ایک نے پلیٹ (Plate) اٹھائی اور کہا کہ یہ طشتری ہے، دوسرے نے کہا یہ "رکابی" ہے۔ اس اختلاف کو دور کرنے کے لیے بیرے (Waiter) کو بلایا اور پوچھا کہ وہ اسے کیا کہتا ہے، بیرے نے جواب دیا "صاحب ہم تو اسے پلیٹ (Plate) کہتے ہیں۔" اس سے معلوم ہوا کہ "پلیٹ" عام فہم اردو لفظ ہے۔ مولوی عبدالحق جب انگلش اور اردو لغت ترتیب دے رہے تھے، تو انہیں ہورس شو (Horse Shoe) کے لیے اردو لفظ کی تلاش ہوئی تو انہوں نے عربی اور فارسی ماخذ سے لفظ بنانے کی کوشش کی، فرس اور اسپ سے مدد لینے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ ایک بار وہ کہیں جا رہے تھے دیکھا کہ راستے میں کچھ مزدور کام کر رہے ہیں، وہیں قریب Horse Shoe پڑا ہوا ملا، مولوی صاحب نے اٹھا کر مزدوروں سے پوچھا کہ "بھئی، اسے آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟"...... انہوں نے جواب دیا "صاحب ہم تو اسے "گھڑ نال" کہتے ہیں"۔

اس طرح مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو گیا۔ اردو میں انجمن ترقی، اردو ہند کا ایک بہت بڑا کام "اصطلاحات پیشہ وران" ہے۔ مولوی عبدالحق کے اس رہنمایانہ کام سے اردو تو اردو ہندی بھی فیضیاب ہو سکتی ہے۔ اردو اور ہندی کو جیسا کہ اس سے قبل کہہ چکا ہوں مماثلت کے باوجود میں سماجی لسانی، اسلوبیاتی اور ادبی اعتبار سے دو زبانیں مانتا ہوں۔ لیکن دونوں زبانیں فراخ دلی اور وسیع النظری سے کام لیں تو دونوں ایک دوسرے کی حریف نہیں بلکہ حلیف بن سکتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو طاقت عطا کر سکتی ہیں۔ افسوس کہ ڈاکٹر گیان چند جین نے اردو میں اس محبت کے رشتے پر زور دینے کی بجائے دونوں میں عداوت اور نفرت کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کام پرشوتم داس ٹنڈن

اور سمپورنانند کرچکے اور ان کی اور ان جیسے انیسویں صدی کے بنگالی سکالروں اور سوامی دیانند سرسوتی نے اردو کے خلاف منافرت کی سیاست کھیل کر ایک زبان "اردو یا ہندوستانی" کو دو زبانوں میں تقسیم کردیا اور اپنے منصوبے میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن اب، توضیحی لسانیات اور بنیادی لفظیات میں جو مماثلت ان میں ہے، ان کی اپنی اپنی شناخت کو فراخ دلی کے ساتھ قبول کرکے ان کے مرتبوں کے ساتھ ایک دوسرے کی طاقت بنانے کی ضرورت ہے۔

ہندی اپنی قدامت اور شناخت کی تلاش میں شمالی ہند میں بولی جانے والی ساری زبانوں کو اپنے چنگل میں لینا چاہتی ہے، میتھلی ان میں سے ایک ہے۔ لیکن جیسے کہ پال براس نے لکھا ہے، لوگ عام طور پر متفق ہیں کہ میتھلی قواعد کے اعتبار سے ایک آزاد زبان ہے اور اس کا اپنا آزاد ادب ہے۔ میتھلی اپنی آزادانہ شناخت کے لیے لڑ رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی ادبی شخصیت اور میتھلی تحریک کی سب سے نمایاں اور نمائندہ علامت ودیاپتی ہیں جو چودھویں صدی میں ہوئے ہیں۔ اگرچہ ودیاپتی کو ہندی اور بنگالی کے چاہنے والے اپنا شاعر مانتے ہیں، لیکن وہ دراصل میتھلی کے شاعر ہیں۔ ودیاپتی کے بعد میتھلی شاعروں کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے ودیاپتی کے اسلوب کو اپنایا اور تقریباً پانچ سو سال تک اس کی ادبی روایت کو زندہ رکھا۔ میتھلی کے جیالے اس بات پر سخت ناراض ہوتے ہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ میتھلی ہندی کی بولی ہے اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ وہ آزاد زبان ہے۔ وہ اپنے لیے ہندی اداروں کی سرپرستی بھی قبول نہیں کرتے۔ ۱۹۴۳ء میں جب ہندی ساہتیہ سمیلن نے میتھلی کی کتابیں شائع کیں تو ڈاکٹر امرناتھ جھا نے اسے "شرمناک" واقعہ بتایا۔ الہ آباد میں ۱۹۴۷ء میں Indian Council for Hindi کا قیام وجود میں آیا۔ اس کونسل نے تین جلدوں میں "ہندی ادب کی تاریخ" شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ تیسری جلد میں اودھی، مارواڑی، بندیلی، بھوجپوری اور میتھلی پر مضامین (ابواب) شائع کیے جائیں

گے۔ میتھلی کے دوران ڈاکٹر ایش مشرا کو جب میتھلی زبان و ادب پر لکھنے کی دعوت دی گئی تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے صاف انکار کیا کہ میتھلی ایک آزاد ادبی زبان ہے۔ (۱)

میں نے اس سے قبل لکھا ہے کہ شمالی ہندوستان کی آج کی بولیاں جو کبھی ترقی یافتہ ادبی زبانیں تھیں، جیسے اودھی، برج وغیرہ وہ آزاد زبانیں تھیں اور ان کا ہندی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

پال براس (Paul Brass) نے یہ بھی لکھا ہے کہ قواعدی سطح پر بھی شمالی ہندوستان کی کئی زبانیں مثلاً اودھی، برج بھاشا یا بھوجپوری کا پنجابی اور میتھلی کی طرح آزاد زبانیں ہونے کا دعویٰ صحیح ہے اور ہندی کے مقابلہ میں ان کی حیثیت الگ ہے۔

> "On grammatical grounds alone, many of the Bhashas or speeches of North India, such as Awadhi, Braj Bhasha, or Bhojpuri have a good claim as Punjabi or Maithti to a sep arate status from Hindi."- (2)

☆......☆......☆

---

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھیے:

Paul Brass: Language, Religion and Politics in North India; Vikas Publishing House, Delhi - 1974 Pages 63 - 70 = 71-72

(2) Ibid, Page-407

پانچواں باب

تاریخ، فرقہ واریت اور گیان چند

ہندوستان زبانوں کا ایک عجائب خانہ ہے۔ ہندوستان کے وسیع تہذیبی تناظر میں اس کی چھوٹی چھوٹی قابل شناخت تہذیبیں بھی ہیں۔ کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کی یہ رنگینی ہندوستان کو ایک امتیازی شناخت عطا کرتی ہے۔ تاریخ کا عمل برسوں پر محیط ہے، یہ دہوں اور صدیوں کا عمل نہیں بلکہ ہزاروں برسوں کو محیط کرتا ہے۔ ہندوستان میں اور دوسرے ممالک میں بھی ایک کے بعد دوسری قومیں آتی اور جاتی رہی ہیں۔ یہ عمل صدیوں سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔ قوموں کی ہجرت (Immigration) کا یہ عمل آب و ہوا، معاشی زندگی، جہاں بانی، تجارت کے تابع ہوتا ہے اور اس ہجرت کے زیر اثر معاشرتی اور تہذیبی و لسانی زندگی میں خاموش تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ایک زمانہ کے بعد دوسرا زمانہ آتا ہے۔ پتھر کے زمانے کے بعد آگ کا اور پھر لوہے کا زمانہ آیا، پھر تجارت اور جہاں بانی کا زمانہ آیا۔ آریہ آئے، ہن آئے، کشن آئے پھر ہندوستان میں پٹھان، ترک اور مغل اور انگریز آئے۔ پٹھان اور مغل ہندوستان میں جہاں بانی اور مال و متاع اور دولت و ثروت کے حصول کے لیے آئے، لیکن پھر انہوں نے اس سرزمین سے ایسا رشتہ جوڑا کہ وہ یہیں کے ہو گئے۔ یہاں کی تہذیبی، لسانی اور فکری زندگی کا انمٹ حصہ بن گئے۔ دودھ میں شکر کی طرح گھل مل گئے، یعنی شیر و شکر ہو گئے۔ یہی حال ہنوں اور کشن قوموں کا رہا ہے۔ انگریز اور

پرتگیز سب کے بعد آئے۔ انہوں نے بھی یہاں حکومت کی، لیکن جہاں بانی اور تجارت کا زیادہ فائدہ انہوں نے اپنے ملکوں کو دیا۔ ان کے لیے ہندوستان ایک تجارتی منڈی سے زیادہ نہ تھا، یہاں کی دولت وثروت وہ اپنے ملکوں میں لے گئے اور اپنے ملک کی معاشی زندگی کو استحکام بخشا۔ اس کے برعکس پٹھان، ترک اور مغل جو مذہبا اسلام کے پیرو تھے یہاں بس گئے اور یہاں کی معاشرتی، معاشی، فکری، تہذیبی ولسانی زندگی کو اپنے فنون، اپنے فن تعمیر، فن مصوری، طریق حکومت اور انتظامیہ کے قواعد سے ایک سیاسی وحدت اور صدیوں سے بنتے گئے تہذیبی امتزاج (Cultural Syneriticism) سے قدامت کے رنگ سے نکال کر اس کی تہذیبی زندگی کو جدیدیت کی راہ پر گامزن کر دیا۔

ہندوستان کی قدیم تہذیب کے بھی اپنے امتیازات تھے۔ ادب اور فنون میں، اعلیٰ فلسفیانہ فکر میں، روحانی زندگی میں، موسیقی اور رقص میں، غرض علمی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا، جس میں قدیم ہندوستانی تہذیب نے اعلیٰ منزلیں سر نہ کی ہوں۔ ریاضی، سائنس، علم الادویہ، فلسفہ وادب کے کئی پہلو ایسے ہیں کہ جن سے عربوں نے استفادہ کیا ہے اور عربوں کی علم پروری سے یہاں کے علوم وفنون دنیا بھر سے متعارف ہوئے۔ اس طرح قدیم ہندوستانی تہذیب اور اسلامی تہذیب نے مل کر جدید تہذیبی زندگی کو مالا مال کیا، اس کے امتیازات قائم ہوئے۔ ہندوستان میں اپنی تہذیبی عظمت اور نشانات وامتیازات کے باوجود، یہاں کی معاشرتی زندگی جو سماجی طبقات میں بٹی ہوئی تھی، انسانی زندگی کا ایک المناک پہلو بھی رکھتی تھی۔ ہندوستان میں اسلام کی آمد نے، یہاں کے طبقاتی نظام کی چولیں ہلا دیں۔ عظمت انسانی کا پیغام دیا، بھائی چارے کی فضا ہموار کی، احترام آدم کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کا ورود معاشرتی اور سماجی اصلاح کی ایک تحریک بھی بن گیا جس کے خوش گوار اثرات بھی پڑے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور پھر یہاں کی ان کی دائمی سکونت سیاسی اغراض و مقاصد بھی رکھتی ہے جس میں حکمرانوں کا عمل دخل تھا تو دوسری طرف صوفیا کی تعلیمات

اور ان کی تبلیغی جوئے رواں کے زیر اثر بھی تھی۔ طبقاتی نظام کی کشمکش، سماجی ناہمواری، انسانی نابرابری کا ہی نتیجہ تھا کہ عوام صوفیا کی تعلیمات کے زیر اثر آتے گئے اور چھوٹے سے حکمران مسلمان طبقہ کے مقابلے میں ان کی تعداد تیزی سے بڑھتی گئی۔ ہندوستان میں اسلام کا فروغ تلوار سے نہیں بلکہ صوفیا کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ حکمران طبقہ کی اپنی سیاست تھی، چنانچہ مسلمان حکمرانوں نے مجموعی طور پر یہاں کی ہندو رعایا کے ساتھ رواداری، محبت اور بھائی چارہ کا سلوک روا رکھا، تاہم بھی مسلمان حکمران دودھ کے دھلے ہوئے نہیں تھے اور ان کے ہاتھوں غیر اسلامی حرکتیں بھی ہوئیں، جبر اور ظلم بھی ہوا۔ یہ سب کچھ سیاسی طاقت کے نشے میں ہوا جو اسلامی تعلیمات کی روح کے سراسر منافی تھا۔ یہ بات ہندو حکمرانوں کے بارے میں بھی صحیح ہے، ان کے یہاں اگر مسلمانوں اور اقلیتوں پر ظلم ہوا تو دوسری طرف وہ مسلمانوں کے تعلق سے انتہائی روادار بھی رہے۔ تاریخی تحقیق کے اپنے تقاضے ہیں۔ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش لایعنی ہے۔ پہلے ہی سے نتیجہ قائم کر کے غلط طریقوں پر منفی نتائج اخذ کرنا علم و آگہی کا مذاق اڑانا ہے۔ کثیر تہذیبی اور کثیر لسانی ماحول میں متعصبانہ اور منفی فکر سے فسطائی طاقتوں کو تو فائدہ پہنچ سکتا ہے، لیکن صحت مند سماج اور مثبت معاشرتی ماحول کے پراگندہ ہونے کا اس میں خدشہ زیادہ ہے اور اگر علمی حضرات فسطائی طاقتوں کی منفی تحریروں سے ان کو تقویت پہنچائیں تو یہ کوئی علمی خدمت نہیں ہوگی۔ ہمارا ہر قدم صحت مند معاشرے کی تہذیب اور تزئین کا متقاضی ہے۔ ہندوستان کے موجودہ سیاسی منظر نامہ میں منفی باتوں کی تشہیر سے زیادہ مثبت باتوں اور واقعات کی پیشکش اور تشہیر ضروری ہے تاکہ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور لسانی آہنگی پیدا ہو اور فسطائی طاقتوں کو روکا جا سکے۔

اردو کے نامور محقق اور عالم پروفیسر گیان چند جین کی تصنیف "ایک بھاشا: دو لکھاوٹ اور دو ادب" اسی طرح کی ایک منفی تصنیف ہے جس میں پہلے سے ایک نتیجہ اخذ کرنے کے بعد اسے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین مجھ

سے بہتر جانتے ہیں کہ تحقیق حقائق کی بازیافت ہے اور حقائق دوران تحقیق منظر عام پر آتے ہیں، نقاب اٹھتے رہتے ہیں اور چہرہ روشن ہو یا قبیح بعد میں سامنے آتا ہے۔ جین صاحب کا مذکورہ کتاب میں طریق تحقیق پہلے سے اخذ کردہ قبیح اور متعصبانہ نتائج کو حسب منشا ثابت کرنے کی مذموم کوشش ہے۔

میں نے سطور بالا میں اپنی گفتگو کا آغاز تاریخی پس منظر میں کیا ہے۔ جین صاحب نے مسلمان حکمرانوں کے تعصب ہندو دشمنی اور ظلم و جور کی باتیں کی ہیں۔ ان میں سے بیشتر واقعات چند متعصب ہندو مورخین کے وضع کردہ ہیں۔ اور یہ وضعی واقعات ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشہور اور معروف بنے۔ ان میں سے ایک واقعہ سومنات کے محمود غزنوی کے ہاتھوں مسمار کرنے کا واقعہ بھی ہے جس کو ہندو مسلمانوں کے حوالے سے قابل نفریں گردانتے ہیں اور مسلمان اس غلط واقعے کو کبر و نخوت اور جہالت میں صحیح سمجھ کر محمود غزنوی کی اسلام دوستی کی علامت تصور کرتے ہیں جبکہ اس واقعہ کی کوئی سند نہیں ہے۔ محمود غزنوی کے فوراً بعد کے وقائع نویسیوں نے سومنات کے مندر کے مسمار کرنے کے واقعے کو اس عہد کے ہندو راجاؤں کی آپسی رقابت اور دولت کی ہوس کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ بعد میں اسی واقعے کو قدیم مسلمان مورخین نے سیاسی ضروریات اور اسلام دوستی کی علامت کے طور پر اپنے کارناموں کی فہرست میں داخل کیا۔ مشہور مورخ پروفیسر رومیلا تھاپر نے سومنات پر اپنے تاریخی مقالے میں اس واقعہ کو جینیوں اور شیو مذہب کے ماننے والے راجاؤں کی آپسی چپقلش کا نتیجہ بتایا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ محمود غزنوی کے محل کا صندلی دروازہ جسے سومنات مندر کا دروازہ بتایا جاتا ہے، وہ سومنات کا دروازہ تھا ہی نہیں اور یہ دروازہ حقیقتاً مصر میں بنا تھا۔ محمود غزنوی کے ہاتھوں سومنات کی مسماری کے غلط واقعے کو بیسویں صدی کی ہندوستان کی فرقہ وارانہ سیاست کو اس عہد کے سیاست دان کے۔ ایم۔ منشی نے اپنی کتاب میں جگہ دی اور اس کی تشہیر کی تاکہ مسلمانوں کے خلاف فرقہ وارانہ سیاست کو تقویت پہنچائی جائے۔

محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں سندھ پر حملہ کیا اور ایک عرصہ تک اس پر حکمرانی کی۔ اس نے یہاں کی رعایا پر محبت، بھائی چارہ، انسان دوستی اور عدل و انصاف کے ایسے نقش چھوڑے کہ وہ محمد بن قاسم کے گرویدہ ہو گئے۔ رعایا خوش حال تھی اور اپنے حکمران کی داد و دہش سے خوش تھی۔ بین السطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم سے پہلے کے حکمران راجہ داہر سے رعایا سخت نالاں تھی کہ وہ ظالم اور جابر راجا تھا۔ جب حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو واپس طلب کیا اور وہ سندھ سے چلا گیا، تو اس کی رعایا جو ظاہر ہے ہندو تھی، محمد بن قاسم جیسے عادل اور انصاف پسند بادشاہ کے چلے جانے پر سخت رنجیدہ تھی، محمد بن قاسم کا سندھ سے واپس جانا انہیں گراں گزرا، تو انہوں نے محمد بن قاسم کا ایک مجسمہ بنایا اور وہ اس کی پرستش کرنے لگے۔ کاش گیان چند جین صاحب ایسے واقعات بھی ذہن میں رکھتے اور ایک طرفہ بغض و عداوت کا اظہار نہ کرتے۔ ہندوستان کی تاریخ میں جہاں چند واقعات مسلمان حکمرانوں کی کم ظرفی اور تعصب کے ہیں وہیں پر بے شمار واقعات ان کی مذہبی فراخ دلی اور جود و سخا اور عفو و درگزر اور رعایا پروری کے بھی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں (محمود غزنوی نے اگرچہ یہاں حکومت نہیں کی) محمود غزنوی چند ہندو مورخین بشمول پروفیسر گیان چند کی نظر میں معتوب اول ٹھہرا، پھر علاء الدین خلجی اور دیگر سلاطین کے ساتھ جن کا تعلق شمال اور دکن دونوں سے رہا، معتوب آخر کوئی نہیں ہے، بلکہ کوشش کی جاتی ہے کہ یہ سلسل دراز تر ہو۔

سلطنت دلی کے قیام کے بعد محمد غوری نے پہلی بار جب سکے ڈھالے تو اپنے سکوں پر ایک طرف سنسکرت میں کلمہ طیبہ تھا تو دوسری طرف علم کی دیوی سرسوتی کی تصویر تھی۔ اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مسلم سلاطین کا مقصد حکومت کرنے کے ساتھ حاکم اور محکوم میں رواداری، محبت اور ایک دوسرے کے لیے عزت و احترام کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ مسلم سلاطین کا یہ مثبت رویہ ہی تھا کہ جس کی وجہ سے وہ ہندوستان میں ایک مضبوط اور پائیدار حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

البیرونی اپنے عہد کی عظیم شخصیت تھی، اس نے نہ صرف ہندوستانی تہذیب و تمدن کو غیر معمولی خراج تحسین پیش کیا ہے بلکہ اس نے سائنسی خارجیت (Scientific Objectivity) کے ساتھ ہندو مذہب کا مطالعہ کیا ہے۔ جس کا مقصد تبلیغ نہیں تھا بلکہ ہندو مذہب اور اس کے معتقدات کی مسلمانوں میں توضیح و تشریح تھا۔ البیرونی پہلا غیر ہندو تھا جس نے پرانوں کا مطالعہ کیا۔ اس نے خود سنسکرت سیکھی کپل کی "ساما کھیہ" اور پتنجلی کا فصیح عربی میں ترجمہ کیا۔ اس نے ہندو مذہب کی ساما کھیہ، پتنجلی اور گیتا کے حوالوں سے تشریح و توضیح کی۔ البیرونی کی یہ دریافت کہ ہندو مذہب کے معتقدات کے مطابق خدا ایک ہے، وہ لافانی ہے اور ازل سے ابد تک رہنے والا ہے جو اپنی طاقت کے بوتے پر سب سے عظیم، دانش کل، زندہ حقیقت، زندگی بخشنے والا، محافظ اور اپنی مختاری میں نادر و یکتا، غیر مماثل ہے" اس کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔(1) جس سے ہندو مذہب کے تعلق سے مسلمانوں کے مثبت رویوں پر روشنی پڑتی ہے۔

البیرونی کی یہی علمی روایت اور ہندو اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور فکر و خیال سے وابستگی اور اعتراف عظمت ممتاز صوفی اور شاعر امیر خسرو نے بھی پیش کیا ہے۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد ہندوستانی سماج کے مختلف عناصر میں یکجہتی اور وحدت قومی کا تصور جو انہیں عزیز تھا اور جو گیرو مسلماں میں تفاوت نہیں چاہتے تھے اس کی نمایاں مثالیں امیر خسرو کی شاعری میں پیش کی گئی ہیں۔ البیرونی اور چودھویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں میں قومی وحدت کے غیر معمولی ثبوت ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی قومی وحدت کا تصور مسلمانوں میں ارتقا پذیر تھا اور انہیں سماج میں ایک باعزت مرتبہ حاصل ہو رہا تھا اور ہندو اور مسلمان ذہنی اور فکری اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہو رہے تھے۔ اس عہد کی ادبی تصانیف اور بطور خاص امیر خسرو کی "نہ سپہر" اور "خضر خان و دول رانی" میں یہ رجحان غالب ہے۔ عہد خسروی ہی سے

(1) E.C. Sachau Ed. Al-Biruni Vol. II Page 27

ہندو اور مسلمانوں میں فوج اور انتظامیہ میں آپسی تعامل Interaction بڑھتا رہا ہے۔ مسلمانوں میں اپنے وطن کے تئیں فخر و محبت کا احساس بڑھتا رہا اور ہندوستان اور اس ملک کی بہت بڑی آبادی میں ہندوؤں کے لیے محبت اور احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ انہوں نے ابتدا ہی سے عربی اور فارسی میں اپنے ملک اور اس کی تہذیب کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ عربی میں حب وطن پر لکھی ہوئی عربی نظم مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے معرکۃ الآرا کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' میں پیش کی ہے۔

حب وطن کا یہ جذبہ اور اپنی ہندوستانی اصل اور ہندوستانی قومیت کا شدید احساس امیر خسرو کی نہ سپہر میں واضح طور پر پیش کیا گیا۔ وہ ہندوستان کی ہر چیز پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے اس کی شان میں رطب اللسان ہوئے ہیں۔ وہ ہندوستان کو کرہ ارض پر اعلیٰ ترین ملک تسلیم کرتے ہیں۔ بقول خسرو حضرت آدم علیہ السلام نے باغ جنت کو چھوڑا تو اپنے لیے ہندوستان کی سرزمین کو پسند کیا۔ اگرچہ انہوں نے ہندوؤں میں رائج چند توہمات پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔ جو عوام میں رائج ہیں لیکن جب وہ ہندوؤں کا غیر ملکیوں کے خلاف دفاع کرتے ہیں تو وہ سائنس، ریاضی، منطق اور علم نجوم میں ان کی غیر معمولی مہارت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ برہمن یونانیوں سے افضل نہیں تو کم تر بھی نہیں ہیں۔ وہ ہندوؤں کی توہم پرستی اور جادوئی علم میں جوستی اور جوہر کی رسوم میں ہوتے ہیں شجاعت اور دلیری کی علامت بیان کرتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں شدید جذبہ کے ساتھ وہ خیر سگالی اور مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی فکر میں انجذاب و امتزاج (Syneiticism) کا یہ عمل چودھویں صدی ہی میں شروع ہو چکا ہے۔ خسرو نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندومت کی روح اسلامی تعلیمات سے مشابہ ہے۔ وحدانیت (monotheism) تخلیق کائنات میں اس کی طاقت اور فنا و بقا کے افکار میں ہندومت اور اسلامی تعلیمات میں مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ افکار صرف دانشوروں اور شاعروں کی تخلیقات ہی میں محدود نہیں ہیں بلکہ اس کا

واضح عکس مسلم حکمرانوں کی عملی زندگی میں بھی پایا جاتا ہے۔

شیخ محمد اکرام نے فیروز شاہ خلجی (۱۳۴۴ء) کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے متعدد سنسکرت کتابوں کے فارسی میں ترجمے کرائے۔ اکرام نے لکھا ہے کہ دلائل فیروز شاہی، Lim - e- Prinkal---- اقسام اکھاڑا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہیں۔ اسی طرح بنگال میں علاء الدین حسن شاہ نے بھگوت گیتا کا ترجمہ کروایا اور اس کے بیٹے نصرت شاہ نے مہا بھارت کا بنگالی میں ترجمہ کروایا۔ میتھلی کے شہرہ آفاق شاعر ودیاپتی نے اپنی متعدد کتب شکریے اور احترام کے تحت نصرت شاہ سے منسوب کی ہیں۔ عہد مغلیہ سے قبل کی لکھی ہوئی ایک تصنیف "دبستان مذاہب" (جس کے مصنف کا نام ابھی تک تحقیق طلب ہے) کے حوالے سے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ اس کتاب (دبستان مذاہب) میں ایشیا کے سارے مذاہب کا ذکر موجود ہے جس میں چوتھی جلد ادب اور احترام کے ساتھ ہندومت اور اس کے مختلف فرقوں کے بارے میں ہے۔ بقول اکرام اس سے اس عہد کی یگانہ روزگار وسعت ذہنی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔(۱)

ظہیر الدین بابر نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کی شخصیت فن سپہ گری، علم وفن اور شعر وادب کا مرقع تھی۔ وہ آداب حکومت سے واقف تھا اور اس کی ضرورتوں کا گہرا ادراک رکھتا تھا۔ وہ شاعر اور ادیب بھی تھا۔ اسے مناظر فطرت، علم ودانش اور تہذیب وتمدن کے مطالعوں سے گہری دلچسپی تھی۔ "تزک بابری" کا مصنف اور "خط بابری" کا موجد شہنشاہ ظہیر الدین بابر ایک دور رس حکمران تھا، اور ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کی رعایا مختلف المذہب تھی ان کی ملکی ضروریات کا شدید احساس رکھتا تھا، اس کی حکمرانی کا بنیادی اصول تدبر اور انصاف پسندی اور اپنی رعایا کے تئیں عزت و احترام کا جذبہ تھا۔ اس کے نام سے اردو کے بھی چند شعر منسوب ہیں۔ اس نے اپنے جانشین بیٹے ہمایوں کے لیے جو وصیت لکھی ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے کہ

(۱) شیخ محمد اکرام: رود کوثر، لاہور ۱۹۸۸ء، صفحہ ۴۳۸۔

ہمارے ایوان سیاست میں ہی نہیں بلکہ جمہوری سیاست میں ہمارے رہنمایان قوم کے دلوں پر نقش کرنے کے لائق ہے۔ وہ لوگ جو بابر کے بارے میں تاریخ کے واقعات کو مسخ کر کے ہندوستانی قومیت کو بدنام کرنے کی کوشش کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور وہ محققین زبان و ادب اپنی معصومیت کے پردے میں فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں وہ بھی بابر کی اس وصیت کو اپنے دلوں پر نقش کر لیں۔ بابر نے ہمایوں کو لکھا:

"فرزند من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے۔ اپنی بادشاہی میں تمہیں ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے: ۱۔ تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دو اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے اور رعایت کے بغیر سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کرنا۔ ۲۔ گاؤکشی سے بالخصوص پرہیز کرو تا کہ اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکریے کی زنجیر سے تمہارے مطیع ہو جائیں ۳۔ تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ سب سے پورا انصاف کرنا چاہیے تا کہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن و امان رہے۔ ۴۔ اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف و احسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی ۵۔ شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو۔ کیونکہ ان سے اسلام کمزور ہو جائے گا ۶۔ اپنی رعیت کی مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تا کہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے۔ (۱)" مجھے یقین ہے کہ بابر کی وصیت گیان چند صاحب کی نظر سے بھی ضرور گزر چکی ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ بابر کی وصیت گیان چند صاحب کی نظر سے بھی ضرور گزر چکی ہوگی۔

(۱) ترجمہ از "انڈین اسلام" (ٹائی ٹس) اس وصیت کی ایک نقل اسٹیٹ لائبریری بھوپال میں ہے۔ بحوالہ رود کوثر از شیخ محمد اکرام۔ صفحہ ۲۳، ادبی دنیا، دہلی۔

مسلم بادشاہوں کی ہندو اور مسلم رعایا کے تئیں رواداری اور انصاف پسندی کی مثالیں تاریخ کے صفحات میں بکھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً اس طرح کے سوالات متعصب سیاست داں، مورخ اور پروفیسر گیان چند جیسے ادیب اور محقق چھوٹے ذاتی فائدوں اور ذاتی تعصب کے جذبہ کی آسودگی کی خاطر اٹھاتے رہتے ہیں۔ ایسے بھی مورخین اور عالم ہیں کہ جنھوں نے اپنی مفسدانہ ذہنی آسودگی کے لیے معصوم، فراخ دل اور وسیع القلب ہندوؤں کو بھی متعصب اور مسلمان دشمن ثابت کرنے میں اپنی طاقت صرف کی اور اس طرح انہیں بدنام کیا۔ مہاراجہ شیواجی کا نام ان ہندو راجاؤں میں سرفہرست ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شیواجی اور مغلوں کی آپسی رقابتیں اور جنگیں مذہبی جنگیں نہ ہوتے ہوئے خالص جہاں بانی اور وسیع تر سلطنت کے قیام کے مقصد کے تحت لڑی جارہی تھیں۔ جس طرح اورنگ زیب کی فوج میں ہندو اور بطور خاص راجپوت سردار تھے جو ہندو راجوں سے برسرپیکار تھے تو اسی طرح شیواجی کی فوج میں سدی یعقوب، سدی ابراہیم ...... جیسے سردار تھے جو مغلوں سے اور عادل شاہیوں سے لڑتے تھے۔ شیواجی کی بحری فوج مسلمانوں سے بھری پڑی تھی۔ شیواجی مہاراج مسلمان پیر اور اولیاء کے ارادت مند تھے۔ مسجدوں، درگاہوں اور قرآن کا نیز مسلمان عورتوں کا احترام کرتے تھے۔ بابا یعقوب سرورؒ جن کا مزار کوکن کے ضلع رتناگری کے ایک گاؤں کیلشی میں ہے، شیواجی کے گیارہویں گرو تھے۔

ہندو مسلم رعایا کے تعلق سے الگ الگ برتاؤ ہو یا حکمران، دونوں کے ساتھ ایک ہی برتاؤ کریں؟ اس مسئلہ کو مشہور صوفی اور عالم حضرت شیخ محب اللہ الہ بادی (وفات ۱۶۴۸ء) کے سامنے پیش کیا گیا اور ان کی رائے پوچھی گئی تو انھوں نے سوال کا جواب دیتے ہوئے وضاحت کی کہ:(۱)

---

(۱) شیخ محمد اکرام: رود کوثر

''حقیقت یہ ہے کہ حکمران کا یہ فرض ہے کہ وہ ہندو اور مسلمانوں میں امتیاز کے بغیر اپنی رعایا کی فلاح و بہبودی کا خیال رکھے، اس لیے کہ وہ سب ایک ہی اللہ کے بندے ہیں اور جو شخص بھی حکمران ہوتا ہے اسے نیک اور بد سب کے ساتھ رحمدلی سے پیش آنا چاہیے۔ جیسے کہ کتابوں میں بیان کیا گیا ہے، رسول اکرم کا سلوک اسی طرح کا رہا ہے۔ قرآن کی تعلیم بھی یہی ہے کہ ''اے رسول، ہم نے آپ کو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کے بھیجا ہے''۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ رحمت کا پیمانہ عالم کے لیے ہے، اسی طرح جس طرح خالق اپنی تمام مخلوق کو اپنی حفاظت میں رکھتا ہے، اسی طرح اپنے منصب کے مطابق ہر شخص کو اپنے سے ادنیٰ لوگوں کے ساتھ رحم دلی کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔''

گیان چند جین سارے مسلمان حکما سے ناراض ہیں اور طنز و تشنیع سے کام لیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ سے تو وہ کچھ زیادہ ہی ناراض رہتے ہیں۔ ہندوستان جیسے بھرے پرے کثیر تہذیبی اور کثیر لسانی ملک میں چھوٹے چھوٹے اختلافات ہونا فطری ہے۔ مختلف مذہبی برادریوں میں مذہبی، تہذیبی اور لسانی سطح پر اختلافات اگر وہ سماجی زندگی کے لیے نقصان دہ نہ ہوں تو ایسے اختلافات ان کے اپنے تشخص کے لیے بھی ضروری ہیں اور تشخص قائم رکھنا بھی برادریوں کے لیے ضروری ہے۔ اتحاد کے ساتھ اختلاف انسانی سماجی اور فکری صحت مندی کے لیے ضروری ہے۔ اگر مذہبی تشخص کے لیے ہمارے علما اور پنڈت اور مذہبی رہنما اپنی تعلیمات میں اس پر زور دیں تو میں اسے قابل اعتراض نہیں سمجھتا۔ آپس میں لڑانا البتہ مذموم حرکت ہوگی، دلوں کو خراب کرنا اور ذہنوں کو مسموم کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ نہ سب کو ہندو بن کر رہنا چاہیے، نہ مسلمان، سکھ، عیسائی یا پارسی بن کر رہنا چاہیے۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ ''ایک ہندو کو اچھا ہندو، ایک مسلمان کو اچھا مسلمان ایک عیسائی کو اچھا عیسائی بن کر رہنا چاہیے'' ...... اور پھر بحیثیت انسان انسان دوست بھی رہنا چاہیے۔ تبلیغ کی سب کو اجازت ہے، ہمارا دستور بھی اس

کی اجازت دیتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کی تعلیمات بھی اسی سمت میں تھیں۔ ہندوستانی سماج میں مسلمانوں میں جو برائیاں پیدا ہورہی تھیں اور سماجی زندگی متاثر ہورہی تھی، شاہ ولی اللہ کی تعلیمات رتحریک کا مقصد ان کی اپنی مذہبی شناخت کے ساتھ انہیں سماجی و معاشرتی نقائص سے بچانا تھا۔ "تفہیمات الٰہیہ" میں انہوں نے معاشرتی اصلاح پر زور دیا ہے اور "وصیت نامہ" میں آنحضرت کی پیروی پر زور دیا ہے۔(۱) اور پھر ان معاشرتی خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں میں آگئی ہیں اور جن کی اصلاح کی کوشش آج ہندو قوم خود کر رہی ہے۔ سب سے پہلے نکاح بیوگان کا ذکر کیا ہے۔ پھر بڑے بڑے مہر باندھنے کی مخالفت کی ہے جو خانہ بربادیوں کا سبب بنتے ہیں۔ تیسری برائی خوشی اور غمی کے موقع پر اسراف کی برائی ہے جس کی وجہ سے قوم غریب ہورہی ہے(۲) اگر ایک مذہبی برادری کی معاشرتی خرابیاں دوسرے مذہبی گروہ کو لگنے لگیں اور اس سے پرہیز کر کے اپنی مذہبی تعلیمات کی طرف انہیں رجوع کیا جائے تو کوئی صحیح العقل اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر گیان چند نے جن علمائے کرام کو اپنی منصوبہ بند منفی فکر کا نشانہ بنایا ہے، ان میں شاہ ولی اللہ، حضرت مجدد الف ثانی اور سرسید احمد خان شامل ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے بارے میں میں اظہار خیال کر چکا ہوں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے تعلق سے ڈاکٹر گیان چند نے حسب عادت غلط نتائج اخذ کیے ہیں کہ یہ علماء کی تعلیمات اور فکر کے سراسر خلاف ہے۔ میں یہاں مجدد الف ثانی سے متعلق تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے۔ مظہر جان جاناں کی مذہبی رواداری اور ہندوؤں اور ہندو مذہب کے تئیں ان کے خیالات پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔ عالم، ادیب اور محقق ڈاکٹر گیان چند جو تحقیق میں سچ بولنے کی

(۱) شیخ اکرام: رود کوثر۔ ادبی دنیا۔ دلی ۶ صفحہ ۵۷۱۔

(۲) ایضاً

تلقین کرتے ہیں، تعجب ہے کہ وہ مظہر جان جاناں کی اس اہم مذہبی رواداراتہ تلقین کو نظر انداز کر دیتے ہیں (غالباً دانستہ)۔ مرزا مظہر جان جاناں کثیر التصانیف بزرگ تھے، جن کے مکتوبات دعوت فکر دیتے ہیں۔ انہوں نے بھی بقول شیخ محمد اکرام "حضرت مجدد الف ثانی کے بارے میں اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ بعض میں صوفیانہ اور شرعی مسائل کی توضیح ہے۔ بعض خطوں سے اس زمانے کی بدنظمی اور بے ترتیبی پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک طویل خط میں ہندوؤں کے آئین و مذہب کی نسبت اپنی رائے لکھی ہے اور چونکہ ایک مسلمہ بزرگ کے قلم سے اس مسئلے پر اس قدر تفصیلی اظہار شاذ و نادر ہی کہیں ہوا ہوگا اس لیے ہم اس کا پورا ترجمہ درج ذیل کر لیتے ہیں:

"آپ نے پوچھا تھا کہ ہند کے کافر، عرب کے مشرکوں کی طرح بے اصل دین رکھتے ہیں یا اس دین کی کوئی اصل تھی اور اب منسوخ ہو گیا ہے؟ دیگر ان لوگوں کے بزرگوں کے حق میں کیسا اعتقاد رکھنا چاہیے!

واضح رہے کہ اہل ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ نوع انسانی کی پیدائش کے شروع میں رحمت الہیہ نے ان لوگوں کی معاد و معاش کی اصلاح کے لیے ایک کتاب "مسمی بہ وید جس میں چار دفتر ہیں اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے واقعات ہیں، ایک فرشتے برہما کا نام (1) کے وسیلے سے جو ایجاد عالم کا واسطہ ہے، نازل کی۔

---

(1) علامہ اقبال کا بھی ایک زمانے میں یہی خیال تھا۔ جب مخزن میں انہوں نے ہندوؤں کے مقدس بھجن گایتری کا ترجمہ شائع کرایا (۱۹۰۲ء) تو اس میں ایک شعر تھا ۔

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو ☆ زائیدگان نور کا ہے تاجدار تو

"زائیدگان نور" کی ترکیب کے متعلق اقبال نے ایک نوٹ دیا تھا۔ زائیدگان نور یعنی دیوتے۔ سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدہ نور کے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے۔ ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا، جن کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا موجب گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا: اقبال

اس زمانے کے مجتہدوں نے اس کتاب سے چھ مذہب استخراج کیے اور اصول و عقائد کی بنا پر ان پر قائم کی۔ اس کو فن دھرم شاستر کہتے ہیں۔ یعنی فن ایمانیات جس سے علم مراد ہے۔ اسی طرح مجتہدین نے نوع کے چار فرقے بنائے اور ہر فرقے کے لیے الگ مسلک مقرر کیا اور فروغ اعمال کی بنا اس پر قائم کی۔ اس فن کا نام کرم شاستر رکھا یعنی فن عملیات جسے علم فقہ کہتے ہیں۔

یہ لوگ نسخ احکام کے منکر ہیں، لیکن چونکہ وقت اور طبیعتوں کے مطابق مناسب تغیر اعمال بھی ضروری ہے، اس لیے دنیا کی ساری مدت کو چار حصوں میں تقسیم کرکے ہر ایک حصے کا نام جگ رکھا ہے۔ ہر ایک جگ کی علامتیں انہیں چار دفتروں سے اخذ کی ہیں۔ جو کچھ متاخرین نے ان میں اپنے تصرفات کیے ہیں، وہ قابل اعتبار نہیں۔

ان کے تمام فرقے توحید الٰہی کے بارے میں متفق ہیں۔ عالم کو مخلوق جانتے ہیں۔ فنائے عالم نیک و بد کی جزا و سزا، حشر و نشر جسمانی اور حساب و کتاب کے قائل ہیں۔ علوم عقلی و نقلی۔ ریاضت، مجاہدات، تحقیق معارف اور مکاشفات میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی بت پرستی شرک کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں۔

ان کے علما نے انسانی عمر کے چار حصے کیے ہیں۔ پہلا تحصیل علم کے لیے، دوسرا معاش اور اولاد کی غرض سے، تیسرا درستی اعمال اور تہذیب نفس کے لیے، چوتھا تجرد و تنہائی کی مشق کے لیے جو کمال انسانی کا انتہائی درجہ ہے اور نجات کبریٰ جسے مہا مکت کہتے ہیں، اس پر موقوف ہے۔

ان کے دین کے قواعد و ضوابط میں نہایت اعلیٰ درجے کا نظم و نسق ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین باقاعدہ مرتب ہوا تھا، لیکن پھر منسوخ ہو گیا۔ ہماری شرع میں یہود و نصاریٰ کے دین کے نسخ کے سوا اور کسی دین کے نسخ کا ذکر نہیں۔ حالانکہ ان کے علاوہ بہت سے دین منسوخ ہوئے اور کئی دین صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے۔ نیز واضح رہے کہ ان آیات کے مطابق "وان من امة الا خلافیها نذیر" (ہر ایک گروہ کا نبی گزرا

ہے)''ولکل امۃ رسول'' (اور ہر ایک امت کا رسول ہوتا ہے) سرزمین ہندوستان میں بھی نبی اور رسول بھیجے گئے جن کے احوال ان کی کتابوں میں مندرج ہیں۔ ان کے اخبار و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صاحب کمال تھے۔ رحمت عامہ الٰہی نے مصلحت انسانی کو اس سرزمین میں فروگزاشت نہیں کیا۔ پیغمبر آخرالزماں ﷺ کی بعثت سے پہلے ہر ایک قوم میں پیغمبر مبعوث ہوتا رہا، جس کی اطاعت اور فرمانبرداری اس قوم کے لیے لازم تھی اور دوسری قوم کے نبی سے ان کو غرض نہ ہوتی، لیکن جب سے ہمارے پیغمبر خاتم المرسلین ﷺ مبعوث ہوئے ہیں، تب سے لے کر جب تک دنیا باقی ہے کوئی اور نبی نہ ہوگا۔ شرق سے لے کر غرب تک تمام دنیا کو آنحضرت ہی کی تابعداری اور فرمانبرداری لازم ہے اور سرور کائنات ﷺ کے دین کے مقابل تمام باقی دین منسوخ ہیں۔ آغاز بعثت سے جس کو آج تک ایک ہزار ایک سو اسی سال ہوتے ہیں جو اس دین کی طرف مائل نہیں ہوا، وہ کافر ہے نہ کہ وہ لوگ جو اس سے پہلے گزر چکے تھے۔

نیز حسب تصریح آیۂ کریمہ۔ ''منھم من قصصنا علیک ومنھم من لم نقصص علیک'' (ان میں سے بعض کا حال تمہارے روبرو بیان کیا اور بعض کا نہیں کیا) جب ہماری شریعت بہت سے انبیا کے حال میں ساکت ہے تو ہم کو بھی ہندوستان کے انبیا کے حق میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ نہ تو ان کے مقلدین کے کفر و الحاد پر ایمان واجب ہے اور نہ ان کی نجات کا اعتقاد لازم ہے، لیکن اگر تعصب نہ ہو تو نیک گمان ضرور کرنا چاہیے۔ اہل فارس بلکہ تمام امم ماضیہ کے حق میں جو خاتم النبیینؐ کے ظہور سے پہلے گزر چکی ہیں اور جن کی نسبت شرع میں کچھ بیان نہیں کیا گیا اور جن کے احکام و آثار راہ اعتدال کے مناسب اور موافق ہیں، اسی قسم کا عقیدہ رکھنا بہتر ہے، کسی کو بغیر قطعی دلیل کے کافر نہ کہہ دینا چاہیے۔ ان (اہل ہند) کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو حکم الٰہی سے عالم کون و فساد میں دخل رکھتے ہیں۔ یا بعض شیاطین کی روحیں جنہیں جسم سے الگ ہو کر اس دنیا میں کچھ تصرف حاصل ہے یا بعض زندہ آدمی جو ان

کے زعم میں حضرت خضر علیہ السلام کی طرح تا ابد زندہ رہیں گے، یہ لوگ ان کی مورتیں یا تصویریں بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کے سبب ایک مدت کے بعد صاحب صورت سے مناسبت پیدا کر لیتے ہیں اور اسی نسبت سے حوائج معاش و معاد کو پورا کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ذکر رابطہ سے مشابہت رکھتا ہے جو اسلامی صوفیہ میں عام ہے اور جس میں صورت شیخ، تصور کیا جاتا ہے اور فیض حاصل کیے جاتے ہیں۔ ہاں صرف اس قدر فرق ہے کہ صوفیہ شیخ کی ظاہری تصویر نہیں بناتے، لیکن یہ بات کفار عرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ بتوں کو متصرف اور موثر بالذات مانتے تھے نہ کہ تصرف الٰہی کا ذریعہ اور انہیں کو زمین کا خدا مانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کو آسمان کا خدا۔ مگر یہ شرک ہے۔ ان (اہل ہند) کا سجدہ سجدہ عبودیت نہیں، بلکہ سجدہ تحیت ہے جو کہ ان کے طریقے میں ماں باپ، پیر اور استاد کے سلام کے لیے بھی عام ہے اور جسے ڈنڈوت کہتے ہیں۔

تناسخ کا اعتقاد رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا۔ والسلام۔

ہندوستان میں ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اور جس کا بار بار تذکرہ کیا جاتا ہے وہ محمود غزنوی ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ جیسا کہ پروفیسر رومیلا تھاپر نے لکھا ہے یہ نہیں ہے کہ وہ واقعی بت شکن تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمان تھا اور اسلام میں بت پرستی سختی سے منع ہے، لہٰذا مندروں کی مسماری اس کے نامہ اعمال کا ہی حصہ بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کا مندروں کو مسمار کرنا اور بتوں کو توڑنا، فرقہ پرست مورخین فرض کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مندروں کو مسمار کرنے یا بتوں کو توڑنے کی دوسری وجوہات تلاش نہیں کی جاتیں۔ بقول رومیلا تھاپر اگر دیگر ہندو راجاؤں کی طرف رجوع کیا جائے تو بت شکنی کے دیگر اسباب بھی سامنے آتے ہیں۔ یہاں پر ایک واضح مثال کشمیر کے راجا ہرش کی ہے جو گیارہویں صدی میں گزرا ہے۔ ہرش منظم طور پر مندروں کو مسمار کرتا تھا۔ کلہن نے راج ترنگنی (Rajatarangini) میں

لکھا ہے کہ راجہ ہرش نے بطور خاص ایک اعلی افسر کا تقرر کر رکھا تھا جو دیوپاتانائکا (Devotpatananayaka) کہلاتا تھا (جس کے معنی ہیں ایسا افسر جس کا کام دیوتاؤں (بتوں کو مسمار کرنا ہے) اس کا کام مندروں کو لوٹنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی مذہبی بت شکن کے نہیں ہیں، بلکہ اس کا واضح مطلب مندروں کو مسمار کر کے دولت حاصل کرنا اور اس دولت کو دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔(۱)

سومنات اور دیگر مندروں کو مسلمانوں کے ہاتھوں مسمار کرنے کا ذکر گیان چند صاحب نے کیا ہے، مذکورہ حوالوں سے ان کے اس الزام کی قلعی کھل جاتی ہے۔ جہاں تک جزیہ لگانے کا سوال ہے، یہ بھی کج فہمی اور لاعلمی یا کم علمی ہی سے عبارت ہے۔ مولانا شبلی نے اس الزام کا مدلل جواب دیا ہے، مگر میں مولانا شبلی کے حوالے کی بجائے اس ضمن میں جدید ترین مورخ کے حوالے سے اس الزام کا بطلان کرنا چاہوں گا۔ حکمران جزیہ غیر مسلم رعایا سے حاصل کرتے تھے۔ برائے بحث یہ مانا کہ مسلم حکمران اسلام قبول کرنے کی خاطر غیر مسلموں پر جزیہ لگاتے تھے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد انہیں زکوۃ ادا کرنی پڑتی جو مسلمان صاحبان ثروت کے لیے لازمی تھی۔ چودھویں صدی کے مشہور سیاح ابن بطوطہ کے مطابق جنوبی ہندوستان میں راجہ زمورین جو ہندو تھا یہاں آباد یہودیوں سے جزیہ وصول کرتا تھا۔ ہندوستان سے باہر بھی

---

(1) Romila Thapar Harbars Mukhia Bipin Chandra: Communication and the writing of Indian History (paper by Romila Thapar on Communism and writing of Ancient Indian History Page 14. Published by Peoples Publishing House, New Delhi - 1969

Also see Ratanlal Hangloo: Social Background of Religous Convers on in 14th and early 15th Century Kashmir in D.C. Sarkar Commemoration Volume. Studies in Ancient History, 1988

مسلمان حکمران اپنی مسلم رعایا سے جزیہ وصول کرتے تھے۔ پروفیسر ہربنس مکھیا نے مذکورہ تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عورتوں، بچوں، معذوروں اور برہمنوں (سوائے عہد فیروز شاہ تغلق کے) اور سپاہیوں سے جزیہ نہیں وصولا جاتا تھا۔ (۱)

اسی مضمون کا ایک اور پروانہ ہے، جو تبرک حسین کو بھیجا گیا تھا، اس پر تبرک حسین کی مہر بھی ہے۔

معاصر جینی لٹریچر کی روشنی میں عالمگیر کی رواداری

ایک اور مضمون میں جتن چندر لکھتے ہیں:

ہندوؤں کے خیال میں اورنگ زیب ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ بدنام حکمران گزرا ہے اور اس پر برابر یقین کیا گیا ہے کہ وہ ہندوؤں کا دشمن تھا اور اس سے جو کچھ بن پڑا، ہندو مذہب اور اس کے پیروؤں کے خلاف برائی کرتا رہا۔ جو مورخین اس قسم کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں، وہ ایسی شہادتیں پیش کرتے وقت ان کا صحیح تجزیہ نہیں کرتے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کی نظر ایسے ماخذوں پر نہیں ہے جو اورنگ زیب پر ایک حکمران اور اسلام کے ایک پرہیزگار، پیرو کی حیثیت سے صحیح روشنی ڈالتے ہوں۔ مجھ کو حال ہی میں جینی ماخذوں سے کچھ ایسی شہادتیں ملی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اسلام کی طرح دوسرے مذاہب اور ان کے پیروؤں کا پورا احترام کرتا ہے۔

سبھاگیہ وجے ایک جینی سادھو تھا۔ اس نے ۱۶۹۳ء میں پراچین تیرتھ مالا لکھی، جس میں قدیم زمانے سے اس کے عہد تک مذہبی پیشواؤں کا حال ہے اس میں چترا وجے کے ذکر میں اپنے چیلہ لال وجے کے بارے میں لکھتا ہے:

(1) Harbars Mukhia: Medieval Indian History and the Communal (Approach in Communalism and the Writing of Indian History - Peoples Publishing House (New Delhi) 1969 (page-30)

اس کا چیلہ لالی وجے گانی جس کا خطاب پنڈت تھا، آگرہ گیا اور اورنگ زیب شاہ دہلی سے ملا۔ دہلی کے اس نیک بادشاہ نے اس کو ایک بڑا پوشالہ (خانقاہ) جینیوں کے فرقہ تو پا گچھا کے لیے عطا کیا اور اس کے لیے ایک فرمان جاری کیا تاکہ وہ وہاں آرام سے رہ سکے۔ (پراچین تیرتھ مالا۔ ص ۹۹)

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اورنگ زیب اسلام کے علاوہ اور دوسرے مذاہب کے لیے جذبہ رواداری رکھتا اور وہ ایک غیر مسلم پیشوا کا بھی احترام کرتا تھا۔ اس کی رواداری کی ایک اور شہادت یہ ہے کہ ۱۶۷۹ء میں ایک جینی مذہبی پیشوا بھیم وجے سوری اسد خاں کے ذریعہ سے اجمیر میں اورنگ زیب کے حضور میں باریاب ہوا اور اس سے ایک فرمان حاصل کیا جس سے وہ جینی خانقاہیں جو اجمیر، مرتا، سوجاٹ، جے تارنہ اور جودھ پور میں خالصہ میں شامل کر لی گئی تھیں، ان کو واگذاشت کرایا۔

اس کا ذکر پٹاولی سا مچھایا، بھیم وجے نوگوناوارنم اور بھیم وجے راسا میں ملے گا، یہ جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۲۷۰۔۲۷۱ پر بھی نقل کر دی گئی ہے جس کو یہاں پر اردو رسم الخط میں نقل کرنا ممکن نہ ہو سکا۔

پٹاولی سا مچھایا میں بھیم وجے سوری کا ذکر تفصیل سے ملے گا جس کی زبانی یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ اورنگ آباد میں تھا تو کس طرح اس کے مراسم اسد خان سے بڑھے اور پھر کس طرح اس نے خانقاہوں کو واگذاشت کرایا۔ بھیم وجے نوگوناوارنم میں اس بیان میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ رب بجر بھ سوری نے بھیم وجے کو خانقاہوں کی حالت بتائی اور اس سے التجا کی کہ وہ اسد خان سے اپنے مراسم سے فائدہ اٹھا کر مذہبی اداروں کو واگذاشت کرائے۔

اس قسم کی اور مثالیں مل سکتی ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ اورنگ زیب نے جین مت کے ساتھ اور بھی رعایتیں کیں۔

ایک جینی شاعر رام چندر نے اپنی ایک کتاب رام ونود میں اورنگ زیب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"بادشاہ اورنگ زیب دلیر اور بہادر ہے میں نے اس کی حکومت کے زمانے میں اپنی کتاب اپنی خوشی اور بڑے امن میں لکھی۔"

جین کے دیگر فرقہ کے ایک مصنف جگت رائے نے اپنی کتاب "پدما نندی پنچ وی لیکا" میں لکھا ہے کہ:

"یہاں اورنگ زیب بادشاہ کی حکومت ہے جو کسی سے نہیں ڈرتا ہے، اس کی حکومت میں مذہبی خیال کے لوگوں کو اپنے اپنے مطالعے میں کسی قسم کا خوف نہیں۔"

اس سے ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے مذہبی عقائد میں آزاد تھا۔(۱)

(جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، اکتوبر ۱۹۵۸ء)

مذہبی رواداری کا یہ سلسلہ شمال تا جنوب پھیلا ہوا ہے۔ عبدالمجید صدیقی نے لکھا ہے:

"پہلے تین سلاطین یعنی سلطان قلی، جمشید اور ابراہیم بے حد وسیع المشرب واقع ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے کبھی مملکت کو مذہبی رنگ نہیں دیا، بلکہ مذہب کو رعایا کے ضمیر اور نقطۂ خیال پر چھوڑ دیا اور تمام طبقات رعایا کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، شیعہ ہوں یا سنی برابر کے حقوق دے رہے تھے۔ ہندوؤں کو نہ صرف ہر قسم کی مذہبی اور سماجی آزادی حاصل تھی بلکہ ان کے مندروں کو بڑی بڑی جاگیریں دی گئی تھیں اور ان کو اونچی خدمات پر فائز کیا گیا۔"(۲)

"ان میں (قطب شاہیوں) رواداری اور رعایا پروری بے حد تھی اور عدل گستری ان کا خاص شعار تھا۔ ان لوگوں نے اپنی تلنگی رعایا کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بادشاہوں نے ہندو طبقے کے مذہبی جذبات کا لحاظ

(۱) سید صباح الدین عبدالرحمن (مرتبہ) ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری (جلد سوم) اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء

(۲) عبدالمجید صدیقی: تاریخ گولکنڈہ، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد ۱۹۶۳ء ص ۳۶۱۔

کر کے "منگل" کو تعطیل عام قرار دی تھی اور تانا شاہ نے بھدرا چلم اور بھر مارا میشورم سوامی نامی مندروں کو جو گوداوری اور کرشنا پر واقع ہیں زرخیز جاگیریں عطا کیں جس سے اس بادشاہ کی کشادہ خیالی اور مذہبی رواداری معلوم ہوتی ہے۔"(۱)

یہی رواداری اور وسیع المشربی عہد مابعد میں جاری رہی، بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان،

"آصف جاہی حکمرانوں نے تقسیم اعزاز و مناصب میں مذہب وملت کا فرق کبھی روا نہیں رکھا۔ ہندوؤں کے مندروں اور دھرم سالوں کی تعداد جنھیں سرکاری امداد ملتی ہے مساجد سے زیادہ ہے اور درگاہوں کے مقابلے میں ہندو مٹھوں کے لیے زیادہ ہیں۔ رواداری کی یہ ایک بصیرت افروز مثال ہے۔ جس سے سارا ہندوستان سبق لے سکتا ہے۔"(۲)

آصف جاہی حکومت کی رواداری ظہیر الدین بابر کی رواداری اور وسیع المشربی کی یاد دلاتی ہے۔ گائے کے ذبیحہ کے سلسلے میں بابر کی ہمایوں کو وصیت کا ذکر ہو چکا ہے۔ سلطنت آصفیہ میں بھی فرمان کے ذریعہ گاؤکشی پر پابندی لگائی گئی تھی۔(۳)

گیان چند جین صاحب ایک وسیع المطالعہ محقق ہیں۔ ان کی نظر سے مذکورہ حقائق ضرور گزرے ہوں گے جو مسلمان بادشاہوں اور فرمارواؤں کی رواداری کی مثالیں ہیں، تاریخ ہند کے ان مثبت پہلوؤں کو آج کے مخدوش حالات میں پیش کرنے کی عصری معنویت ہے، لیکن افسوس کہ ان کی منصوبہ بند منفی تحقیق نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی۔

---

(۱) ایضاً ص ۳۳۶، ۳۳۷

(۲) ڈاکٹر یوسف حسین خاں: تاریخ دکن عہد حالیہ، مطبوعہ ۱۹۳۳ء ص ۳۶۴

(۳)- مانک راؤ وٹھل راؤ: بستان آصفیہ حصہ چہارم، سردار پریس، حیدرآباد دکن ۱۳۳۱ھ ص ۷۴-۷۵

ازمنہ وسطی میں مسلمان بادشاہوں کی طاقت کے لیے آپسی جنگوں کو عام مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کرنے کا رجحان فرقہ پرست مورخین کے یہاں موجود ہے۔ اس سلسلے میں طاقت حاصل کرنے کے لیے خلجی خاندان کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں کہ کس طرح جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے علاؤ الدین خلجی نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اورنگ زیب اور دیگر بادشاہوں کی بھی مثالیں دی جاتی ہیں کہ وہ طاقت کے لیے خود اپنے بھائیوں یہاں تک کہ وہ اپنے باپ کو بھی اذیتوں کا نشانہ بناتے تھے۔ اس طرح کے واقعات اگرچہ حقائق پر مبنی ہیں، لیکن اس کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ہے، اس طرح کی صورت حال اور فرقوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ کوٹلیہ نے اپنے مشہور زمانہ "ارتھ شاستر" میں نارائن پیشوا کو بھی محل میں اسی مقصد سے قتل کیا گیا تھا۔ چھوٹے بڑے سارے محل طاقت یا وراثت کے لیے اس طرح کی سازشوں میں ملوث رہے ہیں۔ لہٰذا منصوبہ بند طریقے سے چند مسلمان حکمرانوں کی مثالیں دیتے ہوئے عام مسلمانوں کو قاتل اور اذیت پسند نہیں کہا جاسکتا۔(۱)

بقول جینت گڈگری:

"All invaders and aggressors were rapacious. Ancient Berbers, Huns, Khans, as well as the modern Spanish, Portugues and British invaders were no rapacious than Muslims invaders. Even the great Ashoka admits to having committed rapacities during his compaign for annexing

---

(1) Jayant Gadhani: Hindu Muslim Communalism - Bombay 1996 page 152.

Kaliga (see the 13th Rock Edict at Sahabzghadi). The revered Manu - Smuruti directs that the best jewel, the most beautiful woman, and the beet canopy plundered in the campaign should be presented to the king (7/96) * (1)

سرسید ہماری قوم کے بہت بڑے مصلح اور معمار تھے۔ ۱۸۵۷ء میں اس قوم پر جو گزری سو گزری، سرسید کو اس قوم کی عاقبت سنوارنے کی فکر لاحق تھی جن کے خون سے سیاسی طاقت اور سامراج کو ترقی دی گئی۔ قوم کے ایک عضو (ہندوؤں) نے اپنی ترقی کو بحال کیا، راجہ رام موہن رائے جیسے مصلحین نے بہت جلد تعلیم کے ذریعہ ان میں جینے کا سلیقہ پیدا کیا اور ترقی کی راہیں دکھائیں۔ مسلمان اس پر آشوب دور میں سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ سامراج کے ہاتھ ان کے خون سے زیادہ آلودہ تھے۔ تعلیم سے انہیں شغف نہیں تھا اور طرز کہن پر اڑنا ان کی فطرت کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ سرسید نے مسلمانوں کو اس قعر مزلت سے نکالنے کا بنیادی نسخہ یعنی تعلیم تجویز کیا اور ہندوؤں کی طرح ان میں تعلیمی، سماجی اور فکری اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور محمڈن اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد پچھڑی ہوئی ہندوستانی قوم کے سب سے پچھڑے ہوئے طبقہ یعنی مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم تھا مگر خدانخواستہ یہ فرقہ بند ذہنیت نہیں تھی مسلمانوں کے ساتھ انہیں ہندوؤں کی اعلیٰ تعلیم اور سماجی و معاشی استحکام بھی عزیز تھا۔

گیان چند نے اپنی کتاب میں سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے سرسید کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے اور ایسے نازیبا الفاظ و القاب سے یاد کیا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے:۔ گیان چند انہیں فرقہ پسند علیحدگی پسند اور متعصب انسان کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، جو خلاف واقعہ ہے۔ کاش! گیان چند صاحب اپنی تعصب کی عینک ہٹا کر سرسید کی

(1) Ibid Hindu Muslim Communalism - Bombay 1996 Page 152.

تحریروں کا غائر مطالعہ کرتے۔ مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ نتائج اخذ کرنے سے قبل حالات و واقعات کا تاریخی پس منظر میں تجزیہ کرے۔ کسی وقت سرسید جذباتی طور پر عارضی حیثیت سے مغلوب ہو گئے ہوں گے لیکن ان کے ننانوے فیصد خیالات اور بیانات وایمان وایقان میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ وہ سارے ہندوستانیوں کو ایک قوم سمجھتے تھے، وہ سیکولر قدروں کے امین تھے اور ہندو مسلمان دونوں کو بحیثیت قوم عزیز رکھتے تھے اور ان کی ترقی کے خواہاں تھے۔ کسی ہندو مصلح نے تعلیمی و سماجی زندگی میں مسلمانوں کا خیال نہیں رکھا جتنا سرسید نے ہندوؤں کی تعلیم و ترقی کا خیال رکھا۔

سرسید نے کالج کے قیام کی وجہ بتاتے ہوئے ۳ فروری ۱۸۸۴ء کو لاہور میں اپنی تقریر میں کہا:

''میرے دوستو! آپ نے اپنے ایڈریس میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا ذکر کیا ہے۔ مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قائم کرنے کا ہوا یہ تھا جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے۔ ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جاوے۔ اس کی مثال اس طرح پر دی جا سکتی ہے۔ فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل طاقتور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے۔ اور اس کی تندرستی زوال پذیر ہے۔ پس اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں۔ یہی خیال تھا جس نے مجھ کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے متعلق ہیں جو

اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت بطور بورڈر کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔"

تقریر بمقام لاہور، ۳ فروری ۱۸۸۴ء
(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۹۸)

مذکورہ خطاب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز پیدا کرنا نہیں ہے۔ بلکہ دونوں برادریوں کو ایک ساتھ ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن کرنا ہے۔ ایک متوازن، حقیقت پسندانہ رویہ ہے جو کثیر تہذیبی ملک کی ضرورت ہے، ایک صحت مند اور صالح انسانی جذبہ ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے عزت واحترام اور ہمدردی اور محبت کے لطیف جذبات کی عکاسی ہے۔

چار سال بعد ۲۶ جنوری ۱۸۸۹ء کو امرت سر میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کالج کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ اس تقریر میں سرسید نے اپنے ہندو بھائیوں کا شکریہ بھی ادا کیا ہے جنھوں نے یہ تعلیمی یادگار قائم کرنے میں ان کی مدد کی تھی۔ سرسید نے کہا:

"مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لیے اور جو افسوس ناک محرومی ان کو یورپین سائنس Science اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی اس کو رفع کرنے کو قائم کیا گیا مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ملک میں

ہم سب نیٹیو ہندوستانی کہے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں، ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لیے موجود نہ کیے جاویں ہماری عزت نہیں ہو سکتی۔ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا، مگر میرا کیا مقدور تھا کہ میں اس کو انجام دے سکتا۔ ان لوگوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس میں مدد کی۔ اس مدد میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں جنھوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی۔ مدرسہ کی عمارت کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جس سے ہمیشہ کو یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ مسلمان بھائیوں کی کس فیاضی سے مدد کی تھی۔"

تقریر امرتسر، ۲۶ جنوری ۱۸۸۹ء
(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۶۷)

انگریز حقارت آمیز لہجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو نیٹیوز کہتے تھے۔ انہیں کے اپنے ملک میں وہ دوسرے بلکہ تیسرے درجہ کے شہری تھے اور ان کی ہندوستانی سماج میں اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ انگریزوں کے اس ذلت آمیز رویہ کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے سرسید نے جو نسخہ کیمیا ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے تجویز کیا وہ ایک دوسرے کے لیے برادرانہ سلوک و محبت تھا۔ ایک ساتھ رہن سہن، بود و باش اور آپسی عزت و وقار ان کی انتہائی منزل تھی۔ جین صاحب اور ان کے ہمنوا، سرسید کے خلوص و دردمندی کی اس آنچ کو محسوس نہیں کر سکے۔ قصور علم کا نہیں بلکہ ان کے ہاں عرفان کی کمی کا ہے۔

مذکورہ تفصیلات بیان کرنے کا مقصد گیان چند جین صاحب کے سرسید کے تعلق

سے الزام کہ وہ "ہندو دشمنی کے خلیفہ تھے" کا بطلان ہے۔

سرسید جوگیان چند کے نشانے پہ ہیں، ایک وسیع القلب اور وسیع النظر عالم، ادیب اور مصلح تھے جن میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کے خیالات ان کی تحریروں میں بکھرے پڑے ہیں: ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

اے میرے دوستو! تمہارے ملک ہندوستان میں دو مشہور قومیں آباد ہیں۔ جو ہندو اور مسلمان کے نام سے مشہور ہیں۔ جس طرح کہ انسان میں بعض اعضائے رئیسہ ہیں اسی طرح ہندوستان کے لیے یہی دونوں قومیں بمنزلہ اعضائے رئیسہ کے ہیں۔ ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ کیا خوب کہا ہے جس نے کہا ہے کہ انسان کے دو حصہ ہیں۔ اس کے دل کا خیال یا عقیدہ خدا کا حصہ ہے اور اس کا اخلاق اور میل جول اور ایک دوسرے کی ہمدردی اس کے ابنائے جنس کا حصہ ہیں۔ پس خدا کے حصہ کو خدا پر چھوڑ دو اور جو تمہارا حصہ ہے اس سے مطلب رکھو۔

اے عزیزو!...... ہندوستان ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں عادتیں لے لیں۔ یہاں تک کہ ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کرلی، جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی۔ پس اگر ہم اس حصہ میں جو نہ ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے قطع نظر کریں اور درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں بہ اعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے۔ اور آپس کے نفاق اور

ضد و عداوت ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو اس نکتہ کو نہیں سمجھتے۔"

لیکچر بمقام پٹنہ ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء
(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۳۲_۱۳۳)

اسی طرح سرسید نے جگہ جگہ اپنے تصور قوم اور سیکولر نظریات پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ گیان چند صاحب نے ان خیالات کو صحیح سیاق میں دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ ان کی زیر نظر کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں وہ محقق، عالم اور استاد کم اور قسطائی نقطہ نظر کے سیاست دان بنتے یا انہیں طاقت بخشنے کی کوشش میں زیادہ مصروف ہیں۔ یہاں مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ جملہ یاد آرہا ہے کہ: "اچھے استاد کی پیشانی پر علم نہیں بلکہ محبت لکھا ہوتا ہے۔"

گیان چند کے یہاں علم کا اظہار ہے، محبت اور انصاف پسندی موجود نہیں ہے۔

پہنچے جو شیخ حشر میں تو مال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

☆......☆......☆

چھٹا باب

فرقہ وارانہ سیاست اور اردو ہندی کا مسئلہ

گیان چند جین نے اپنی کتاب کے دسویں باب "ہندی اور اردو کا تنازع اور فرقہ وارانہ سیاست" میں دل کھول کر اپنی فرقہ ورانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں بھی وہ حقائق سے کم قیاس آرائیوں سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ محمود غزنوی کے حوالے سے بت شکنی کا یہاں بھی ذکر ہے۔ اس تعلق سے گزشتہ صفحات میں تاریخی حوالوں کے ساتھ گفتگو کر چکا ہوں۔ گیان چند صاحب لکھتے ہیں:

"محمود غزنوی جیسے شخص کا سومناتھ کی سورتی کو توڑنا اور مندر کو لوٹنا!
اس نے صدیوں تک ہندوؤں پر تلخ اثرات چھوڑے ہوں گے۔"
اسلامی سلطنتوں کا دور فاتح اور مفتوح میں ذہنی اور جذباتی فاصلے کا دور رہا ہوگا۔"

(ص ۱۵۵)

اسی طرح کی بے سروپا باتوں سے اس باب کا پیٹ بھرا گیا ہے، ان ساری باتوں کو تاریخ نے جھٹلایا ہے۔ محمود غزنوی کے اس واقعہ کو انیسویں صدی میں اٹھایا گیا اور بیسویں صدی میں فرقہ وارانہ سیاست کو طاقت بخشی گئی اور کنہیا لال منشی (K.M.Munhi) نے اس نیم افسانوی واقعے کو اچھالا۔ جین صاحب نے قاضی عبدالودود کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے سیکولر ہونے کے دعوے کا ذکر کیا ہے اور سرزنش بھی کی ہے۔ جین صاحب خود اپنے آپ کو سیکولر اور لامذہب کہتے رہے

ہیں لیکن قارئین نے دیکھا کہ سیکولرازم ان کے سائے سے بھی دور بھاگتا ہے۔

ا۔ ہندوؤں کے مندر توڑے گئے۔

۲۔ راجپوتوں کی راج کماریوں کے ساتھ زبردستی شادیاں کی گئیں۔

۳۔ ہندوؤں پر جزیہ لگایا گیا۔

۴۔ ہندوؤں کے ہر بڑے تیرتھ سومناتھ، بنارس، اجودھیا، متھرا میں سب بڑے مندروں کو توڑا گیا۔

جین صاحب کے مذکورہ فرمودات بے بنیاد ہیں۔ یا اس کی صحیح وجوہات معلوم نہیں کی گئیں۔ بشمبر ناتھ پانڈے اور کئی دیگر مورخین نے ایسے واقعات پر حوالوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے انہیں رد کیا ہے۔ بنارس کا مندر توڑنے کا واقعہ خود ہندو پروہتوں کے ہاتھوں، کچھ کے ہندورانی کے ساتھ شرمناک سلوک کی وجہ سے ہوا۔ یہ سلوک اورنگ زیب برداشت نہیں کر سکے۔ پھر مندروں اور مسجدوں کو سازشوں کا مرکز بننے سے روکنے کے لیے بھی انہیں توڑا گیا۔ بشمبر ناتھ پانڈے نے اورنگ زیب کے ہاتھوں تانا شاہ کی مسجد شہید کرنے کا بھی واقعہ لکھا ہے۔(۱)

''مسجد قوت الاسلام'' والی بات البتہ افسوس ناک ہے۔ طاقت کے نشے میں ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں، جن پر اظہار شرمندگی کے سوا اہل اردو کچھ نہیں کر سکتے۔ بشمبر ناتھ پانڈے نے اورنگ زیب کے ۹۳ فرامین کا ذکر کیا ہے، جن کی رو سے مندروں کو جائیدادیں دی گئیں۔ ایسے دو مندر مہاراشٹر میں ہیں۔ جین صاحب نے ٹیپو سلطان کے بارے میں گہر افشانی نہیں کی ورنہ وہ دیکھتے کہ یہ بھی کیسا وسیع المشرب اور رواداربادشاہ تھا اور مندروں کو اس نے کیسی کیسی جاگیریں دی ہیں۔

---

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھئے۔

B.N. Pande: Islam and Indian Culture - KBO Public Library, Patna 1994 Page 36-37

یہاں ایک بات کا ذکر خصوصی طور پر کرنا چاہوں گا۔ اورنگ زیب جو مندروں کو توڑنے کے لیے جین صاحب کے نشانے پر ہے، اسی اورنگ زیب نے نہ صرف ہندو مندروں کو جائیدادوں سے نوازا بلکہ جین مندروں کو بھی نوازا اور جین عالموں کی بھی اعانت اور سرپرستی کی ہے جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔(۱)

جہاں تک غیر مسلم خواتین (راجکماریوں) سے شادی کا تعلق ہے، اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مسلمان بادشاہ، مسلمان ضرور تھے، مگر اکثر پابند مذہب نہیں ہوتے تھے، سیاسی معاملات کو مذہبی سے زیادہ سیاسی نظروں ہی سے دیکھتے تھے۔ انہیں اشاعت اسلام سے دلچسپی نہیں تھی، انہیں حکمرانی کرنی تھی۔ راجکماریوں سے جہاں تک شادیوں کا تعلق ہے، یہ شادیاں سیاسی تعلقات کو استحکام بخشنے کے لیے ہوتی تھیں۔ یہ صرف مسلمان بادشاہوں کا طرز سیاست نہیں تھا بلکہ کچھ ہندو راجا کے یہاں مسلمان خواتین کی بھی شادیاں ہوئی ہیں۔ راجوری، لداخ اور بلتستان میں بھی اس طرح کی شادیوں کا ذکر ملتا ہے۔ مہاراشٹر کے پیشوا باجی راؤ اول کا ایک مسلمان رقاصہ مستانی سے معاشقہ مشہور ہے اور اس کا اظہار بہت فخر کے ساتھ مراٹھی ادب میں بھی ملتا ہے۔ مستانی باجی راؤ کے ساتھ اپنا سارا وقت گزارتی تھی اور اس کے ساتھ جنگوں میں بھی شریک رہتی تھی۔ اس کا بیٹا شمشیر بہادر تھا۔ اس کی مسلمان کی حیثیت سے پرورش کی گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ برہمنوں نے اسے ہندو مذہب میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ وہ ۱۷۶۱ء میں تیسری جنگ پانی پت میں مارا گیا ☆☆۔ ہندوؤں میں ذات پات کی شدت کی وجہ سے البتہ مسلمان خواتین سے شادی بیاہ کے رشتے کم ہوئے ہیں۔(۲)

---

(۱) مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری (جلد سوم) مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین، اعظم گڈھ

(2) B.N. Pande: Islam and Indian Culture - K.B.O. Public Library, Patna. 1994 Page 18

تاریخ میں اس طرح کے واقعات اور بھی مل سکتے ہیں لیکن یہ ایک غیر علمی موضوع ہے جس پر وقت صرف کرنا غیر ضروری ہے، تاہم اس سلسلے کی ایک حالیہ مثال حیدرآباد کے وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد کی ہے جن کی سات بیویوں میں سے تین ہندو اور چار مسلمان تھیں۔ پہلی بیوی رانی کشنا بائی الملقب بہ مبارک محل، دوسری رانی رادھا بائی الملقب بہ راحت محل، تیسری نیلین بیگم الملقب بہ شاد محل، چوتھی خوشیہ بیگم الملقب بہ مسرت محل پانچویں آفتاب محل الملقب بہ فرحت محل چھٹی رحیمہ بیگم الملقب بہ عشرت محل اور ساتویں رانی دھرو پتی بائی الملقب بہ تہنیت محل تھیں۔(۱) ان مسلمان خواتین سے شادیاں کسی سیاسی مصلحت کے تحت نہیں تھیں، اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بقول مہدی نواز جنگ:

"ان کے خاندان میں بزرگوں کے وقت سے مسلمان عورتوں سے بھی ازدواج کا طریقہ جاری تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اصول رکھا گیا تھا کہ جن محلات سے ان کی اولاد ہو جائے تو مذہب کے تعلق رواداری کی جائے اور جس مذہب پر ہیں ان کی اولاد بھی ان کے اصل مذہب پر چلتی رہے، مہاراجہ کشن پرشاد بھی اس آبائی اور خاندانی رواج پر چلتے رہے۔"(۲)

گیان چند صاحب کے سارے اعتراضات کا جواب دینا قلیل عرصہ میں نہ ممکن ہے، نہ اس کی ضرورت۔ ان کے ذہن کا قاری کو پتہ چل ہی گیا ہے، تاہم منتخب باتوں ہی کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ محمد مستعد خان نے اورنگ زیب کے بارے میں

☆ اس سلسلے میں دیکھیے۔ راقم الحروف کی کتاب "پونے کے مسلمان" جس میں مستانی کا ذکر ہے۔

(۱) ڈاکٹر حبیب ضیاء: مہاراجہ کشن پرشاد شاد: حیات اور ادبی خدمات، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۷۸ء ص ۲۶۔۲۷

(۲) مہدی نواز جنگ: مہاراجہ کشن پرشاد ص ۲۸۳ مطبوعہ حیدرآباد ستمبر ۱۹۵۰ء

جو لکھا ہے اس کا حوالہ، محبوب صدا کے حوالے سے ہے۔ میں اصل کتاب دیکھ نہیں سکا ہوں، تاہم اورنگ زیب ، ہندو اور مندروں کے بارے میں اس کے مجموعی رویے کے بارے میں اس سے قبل اظہار کر چکا ہوں جسے قارئین کتاب نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ اورنگ زیب مغلوں کا آخری طاقت ور بادشاہ تھا، اس نے ''سلطنت کو ریت کی دیوار بنا دیا'' (ص ۱۵۸)۔ یہ اورنگ زیب کے ساتھ ناانصافی ہے۔ جانشین کمزور تھے لہٰذا سلطنت بھی آہستہ آہستہ کمزور پڑ گئی، ہر دور حکومت عروج کو پہنچنے کے بعد زوال پذیر بھی ہوتا ہے۔ کسی بھی دور حکومت کو استحکام حاصل نہیں ہوتا، لیکن کیا یہ تاریخ ساز واقعہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار اورنگ زیب نے ملک کو ایک لڑی میں پرو دیا اور متحدہ ہندوستان بنایا؟

گیان چند جین کی اس بات کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ ''بیرونی مسلمان اپنے ساتھ نہ اردو لائے تھے نہ کھڑی بولی، دلی اور مدھیہ پردیش کے علاقے میں کھڑی بولی اور برج بولی جاتی تھیں'' ص ۱۵۸)۔ کوئی بھی قوم کسی بھی زبان کو گھوڑوں پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لے جاتی۔ زبانیں فطرتاً تشکیل پاتی ہیں۔ کبھی کبھی ان کے تشکیل پانے میں بیرونی اثرات یا زبانوں کا ربط تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ اردو اسی لسانی ربط باہمی کا نتیجہ ہے جس کے گیان چند صاحب منکر ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ کھڑی بولی میں عربی فارسی کے اثرات سے یہ زبان بنی اور سنوری۔ جہاں تک زبان کے رسوم الخط بدلنے کا سوال ہے کہ مسلمان جہاں کہیں گئے انہوں نے اولاً وہاں کی زبان کے رسم الخط کو بدلا، یہ ایک غیر لسانی اور غیر تاریخی مفروضہ ہے جس کی حیثیت قطعاً یہ Fantasy سے کم نہیں۔ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام کا پیغام مختلف ممالک میں عربی میں نہیں بلکہ وہاں کی مقامی زبانوں میں دیا گیا۔ افریقہ اور دیگر قبائلی زبانوں کو جن کے پاس رسم الخط نہیں تھا،

انہیں البتہ عربوں نے اپنے رسم الخط میں سنوارا اور ان کے اثر کے تحت وہاں کی زبانوں میں عربی الفاظ بھی داخل ہوئے۔ اس عہد میں یعنی اسلام کے عہد عروج میں مذہب کے ساتھ عربی زبان بھی ایک بہت بڑی لسانی طاقت تھی جس نے یورپ اور افریقہ کو متاثر کیا۔ جو زبانوں کا فطری تقاضہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں کھڑی بولی کے بعد جب ایک کل ہند رابطہ کی زبان تشکیل پا رہی تھی تو اسے بھی انہوں نے ابتدا میں فارسی رسم الخط اور بعد میں ہندوستانی زبان ہونے کے ناطے اس کی اپنی ضرورت کے پیش نظر "اردو رسم الخط" کو سنوارا، یہ بھی ایک تاریخی و لسانی عمل تھا، کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد رسم الخط کی دو متوازی روایتیں تھیں، ایک سنسکرت روایت اور دوسری فارسی روایت۔ چنانچہ ابتدا میں برج، اردو اور سنسکرت تحریری روایت (دیوناگری) اور فارسی روایت میں لکھی گئی۔ یہی حال اودھی کا بھی ہے، تلسی داس کی رامائین دیوناگری میں ہے اور پدماوت، اکھراوٹ (جائسی) چنداین (ملاداؤد) مرگاوتی (عثمان) اور چتراولی (قطبن) فارسی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں۔ کسی شاہی فرمان کے بغیر باقی ساری زبانیں اپنے اپنے رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں اور بعد میں بھی لکھی گئیں۔ صرف قدیم بنگالی کو بنگالی کے ساتھ فارسی رسم الخط میں بھی لکھا گیا لیکن پھر بہت جلد بنگالی نے اس رسم الخط کو ترک کر دیا۔

جہاں تک سرکاری زبان بنانے کا سوال ہے، اس زمانے میں سرکاری زبان کا تصور ہی نہیں تھا البتہ انتظامی امور میں حکمرانوں کی اپنی فارسی زبان رائج تھی۔ جنوب میں عادل شاہیوں نے مراٹھی بھی استعمال کی، اگرچہ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اس عہد میں کوئی لسانی پالیسی نہیں تھی۔ قومی زبان کا تصور نہیں تھا۔ صرف انتظامی (Administrative) زبان کا تصور تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور مہاراجہ شیواجی کے عہد میں

بھی فارسی انتظامی زبان تھی اور پنجابی اور مراٹھی آزادانہ طور پر ترقی پذیر تھیں۔

عہد وسطیٰ کے بعد جب یورپین اقوام نے ایشیائی اور افریقی ممالک کو فتح کیا یا نوآبادیاں قائم کیں تو البتہ انہوں نے انگریزی، فرانسیسی، ڈچ اور پرتگالی کو اپنے ملکوں پر مسلط کیا، عرصہ تک مصر اور ایران میں فرانسیسی رائج تھی۔ افریقہ کے ایک بڑے حصے میں انگریزی رائج ہوئی اور اسی طرح ڈچ اور پرتگالی زبانوں کو اپنے رسم الخط کے ساتھ رائج کیا۔ ہندوستان میں انگریزوں نے اردو کے ساتھ انگریزی رائج کی، پھر اردو کو پس پشت ڈال کر انگریزی کو رومن رسم الخط میں رائج کیا اور انگریزی اور رومن رسم الخط کو اس قدر مقبول بنایا کہ بعد میں رومن اردو کے بعد ہندوستان کی ساری زبانوں کے لیے رومن رسم الخط رائج کرنے کی کوشش کی۔

گیان چند جین کے مقامی رسم الخط کو ختم کرنے اور عربی / فارسی رسم الخط مسلط کرنے کے الزام کو انتہائی علمی و تاریخی انداز میں شمس الرحمن فاروقی نے "ایک بھاشا: دو لکھاوٹ اور دو ادب" پر اپنے تبصرہ میں رد کیا ہے۔

میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت (گیان چند اسے اسلامی دور کی تاریخ کہتے ہیں) پر مفصل اظہار خیال کیا ہے جس میں جفا کاریوں سے زیادہ رواداری اور منصفانہ برتاؤ ہے (جفا کاریاں ہر عہد، ہر زمانے اور ہر خطہ زمین میں ہوئی ہیں، ہندو دور میں بھی اشوک اعظم سے لے کر دور جدید تک اس کی مثالیں ہیں۔ نریندر مودی کے گجرات کے مسلم کش فسادات جو ۲۰۰۱ء میں ہوئے جرمنی میں نازیوں کے ظلم و ستم اور حالیہ کوسووہ میں مسلمانوں کے خلاف بربریت کا نمونہ تھے جس سے انسانیت دہل گئی تھی۔ افسوس کہ گیان چند جین صاحب ان ساری باتوں کو اپنی فرقہ ورانہ عصبیت میں بھول گئے، شاید اس لیے کہ ان کی کتاب علمی پس منظر میں نہیں بلکہ قاشت سیاسی پس

منظر میں لکھی گئی ہے)۔ پیغمبر امن گاندھی جی کا قتل بھی مسلمانوں کے خلاف فرقہ ورانہ جارحیت کا نتیجہ تھا۔ بمبئی اور بھیونڈی میں شیوسینا کے فسادات تو حالیہ واقعات ہیں، اسی طرح ۲۰۰۱ء میں گجرات کے فسادات اور NDA کی تاریخ پر یلغار بھی تاریخ بھلا نہیں پائے گی جس کی شدت سب نے محسوس کی اور جس کے خلاف سیکولر ذہن کے لاتعداد ہندوؤں نے آواز بلند کی۔ انسان کے اندر ایک شیطان بھی بیٹھا ہے، مسلمانوں میں بھی اور ہندوؤں میں بھی۔

☆......☆......☆

ساتواں باب

فارسی اور سنسکرت سے اردو کا لسانی اور ادبی رشتہ

زبان کو ماہر لسانیات بنیادی طور پر تقریری زبان کہتے ہیں، یعنی زبان وہ ہے جو تقریر کے لیے بول چال میں استعمال ہوتی ہے۔ تحریری زبان کی حیثیت ثانوی ہے۔ یہ جزوی حقیقت ہے کل نہیں۔ ہر چیز کے مطالعے کے دو یا دو سے زیادہ پہلو بھی ہوتے ہیں۔ علم پوری طرح دنیا میں نازل نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ علمی افق روشن ہوتے ہیں۔ علم ایک نقطہ آغاز ہے پھر وہ آہستہ آہستہ پر وبال اختیار کرتا ہے اور اسے وسعتیں نصیب ہوتی ہیں۔ سماجی علوم ہوں یا طبعی علوم، یہ ایک ساتھ مکمل طور پر انسانی ادراک کا حصہ نہیں بنے، بلکہ آہستہ آہستہ تجربات کی منزلوں سے گزرے۔ سارے علوم میں ارتقا کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دنیا تو آہستہ آہستہ بنی، پہلے انسان پیدا ہوا، پھر قبیلے بنے پھر سماج بنا اور پھر ملک اور تہذیبیں بنیں۔ انسان جب پیدا ہوا تو وہ ننگ دھڑنگ پیدا ہوا، یہ ایک بنیادی حقیقت ہے پھر پتھر سے آگ کے زمانے تک اس نے ترقی کی اور آہستہ آہستہ آج کے زمانے تک اس نے اپنی شناخت بنائی۔ ملکوں ملکوں کپڑے پہننے کا رواج ہوا، پہننے کھانے کا طرز ہر ملک کا جداگانہ ہے۔ خود ہمارے ملک میں شمال تا جنوب اور مشرق تا مغرب تہذیبی زندگی میں وحدت میں کثرت ہے۔

زبانیں بھی انسانی زندگی کی طرح تنوع کی دلکشی رکھتی ہیں۔ آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہیں، بول چال یا تقریر کی حدوں کو پھلانگتی ہیں اور اپنی شناخت قائم کرتی ہیں۔ انسانی

اور تہذیبی زندگی کے مطالعوں کی طرح زبان جو بول چال کا ذریعہ ہے، وہ بھی ارتقا پذیر رہتی ہے۔ انسان بحیثیت انسان ایک ہے لیکن کہیں وہ ہندوستانی ہے کہیں عرب و ایرانی ہے، کہیں جرمن، فرانسیسی، انگریز یا امریکی ہے جو طرح طرح کے ملبوسات میں زیب تن رہتا ہے۔ کہیں کہیں قبائلی بھی ہیں جو آج بھی اسی قدیم طرز کی تنگ دھڑنگ زندگی گزار رہے ہیں، اسی اصل آدمی کی جو صدیوں پہلے پیدا ہوا تھا جنگلی جانوروں یا پھول پتوں پر اپنا گزارا کرتا تھا۔ اس کا سماجی علم الانسان Social Anthropology اور تہذیبی بشریات (Cultural Anthropology) کے ذریعہ مطالعہ کیا جاتا ہے۔ زبان کے مطالعے کے بھی اسی طرح مختلف زاویے ہیں اور ان کی اپنی اپنی شناختیں قائم ہو چکی ہیں۔ تقریری زبان کا لسانی مطالعہ توضیحی لسانیات کی مدد سے کیا گیا۔ اس علم کی عمر ابھی سو ڈیڑھ سو برس سے آگے نہیں بڑھی۔ توضیحی لسانیات کی روشنی میں جین صاحب اردو اور ہندی کو ایک زبان مانتے ہیں۔ توضیحی لسانیات کی سطح پر یہ بات صحیح ہے، لیکن سماجی لسانیات، اسلوبیات، جمالیات (لسانی) کی رو سے بھی زبان کے مطالعے ہوتے ہیں۔ زبانوں کا مطالعہ جزوی طور پر نہیں بلکہ کلی طور پر ہوتا ہے اور پھر ''ہم ایک زبان'' یا ''دو زبانیں'' کے دائرہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دیگر سماجی علوم اور طبعی علوم کی طرح لسانیات میں بھی جس کا تعلق سماجی علوم اور طبعی علوم دونوں سے ہے گزشتہ پچاس برسوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے اور لسانیات کے مختلف شعبے اپنی آزادانہ شناخت قائم کر چکے ہیں۔ زبان کے مطالعے کے بارے میں صرف توضیحی لسانیات Descriptive Linguistics کو ہی پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کرتے ہیں اور لسانیات کے دیگر شعبوں سے پہلو تہی کرتے ہیں تو یہ بات اس طرح ہوتی ہے کہ کوئی ہاتھی کا کان پکڑ لے اور سمجھے کہ یہی ہاتھی ہے۔ ہاتھی کے کان، اس کا ڈیل ڈول، چار ستون نما پاؤں، یعنی پورا ہاتھی دیکھے بغیر ہاتھی آپ کی نظروں میں نہیں سما سکتا، اسے آپ پہچان نہیں سکتے۔ وہ ہمیشہ آپ کے ادراک سے باہر ہو جاتا ہے۔

لسانیات میں زبان کی تقریری حیثیت مسلم ہے اور تحریری زبان کی یا اہمیت نہیں ہے یا اس کی حیثیت ثانوی ہے، اب قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔ دو لسانیات کے تحت دو زبانوں کے ارتباط سے تیسری زبان کے تخلیق ہونے کے امکانات اور واقعات موجود ہیں۔ Uriel Weinreich کے حوالے سے مذکورہ سطور میں یہ بات واضح کی گئی ہے۔ اسی طرح جدید زمانے میں زبانوں کے تعلق سے ایسے متعدد حالات (Phenomina) بھی سامنے آئے ہیں اور ان کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے۔ مطالعہ زبان کے تناظر میں گزشتہ پچاس برسوں میں حیرت انگیز انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور نئے تصورات نے جنم لیا ہے جو زبان کے ثانوی مطالعہ کی تشریح و توضیح میں مددگار و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ زبان کے مطالعے کے اس نئے زاویہ نگاہ نے ہماری دلچسپیوں میں اضافے کیے ہیں اور بے شمار زبانیں جو ماضی میں ناقابل مطالعہ سمجھی جاتی تھیں، اب قابل مطالعہ بن گئی ہیں۔ ہماری اپنی زبانوں کی بولیاں، قدیم قبائلی زبانیں اور زبانوں کی مختلف شکلیں (Structures) جنہیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے لسانی نقطہ نظر ہی سے اب قابل مطالعہ بن گئی ہیں۔ کری اول (Creole) اور پجن (Pidgin) کا مطالعہ بھی ان کے آغاز اور ترقی کی کہانی سناتا ہے جو ابتدائی تشکیلی عہد میں نظرانداز ہوتی رہیں، اگرچہ سماجی سطح پر ان کی اپنی اہمیت تھی۔ ان کی اہمیت لسانی بھی ہے اور بشریات (Anthropology) کے اعتبار سے بھی ہے۔

پجن (Pidgin) زبان کا وہ اظہار ہے جو دو زبانوں کے ارتباط سے، نچلی سطح پر ابلاغ و ترسیل کا کام کرتا ہے، یہ ٹوٹی پھوٹی (Broken) زبان تجارتی اغراض و مقاصد کے طور پر روپ اختیار کرتی ہے۔ جب یہی ٹوٹی پھوٹی زبان (Pidgin) اظہار کے ذریعہ کی حیثیت سے اپنی شناخت بنا لیتی ہے اور پہلی یا مادری زبان کا درجہ حاصل کرتی ہے تو وہ کری اول (Creole) بن جاتی ہے اور پھر اسی کی ترقی یافتہ شکل رابطے کی زبان (Lingua Franca) بن جاتی ہے۔ سماجی لسانیات کے عروج کے بعد مطالعہ زبان کے

یہ پہلو جو اس سے قبل نظر انداز ہوتے رہے، ان کی اپنی حیثیت علمائے زبان کے ہاں مستحکم ہوگئی ہے۔ ان تینوں میں رابطہ کی زبان (Lingua Franca) کو جس کی لسانی خصوصیات جو بھی ہوں لیکن جو ابلاغ و ترسیل (Communication) کے لیے استعمال ہوتی ہے، اہمیت دی گئی ہے۔ اردو والے مراٹھی، گجراتی، بنگالی اور دیگر زبانوں کے بولنے والوں کے ساتھ ہندوستان میں، عرب ممالک کے اہم تجارتی شہروں میں، لندن، امریکہ اور کینیڈا میں، یہی رابطہ کی زبان استعمال کرتے ہیں، جسے اردو یا ہندوستانی کہا جاتا ہے۔ اب گزشتہ ساٹھ برسوں میں اسے ''ہندی'' کے نام سے بھی پیش کیا جارہا ہے۔ اردو یا ہندوستانی کی جگہ ''ہندی'' کا لفظ دراصل ''ہندی'' کی لسانی شناخت (identity) کی تلاش کا مسئلہ ہے۔ زبان کے Pidgin سے Creole اور پھر رابطہ کی زبان کا مسئلہ، زبان کو زندگی میں رائج کرنے کا مسئلہ ہے۔ مشہور امریکی ماہر لسانیات رابرٹ ہال جس نے پجن (Pidgin) اور کری اول (Creole) کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کی وضاحت کے مطابق:

> "Creolisation is simply one manifestation of a broader process which for want of a better term, we ca: call "nativisation". A language is nativised when it is taken over by a group of speakers who have previonely some other language, so that the new language becomes the native language of the group." (1)

---

(1) Robert A. Hall Jr. Pidgin and Creole language, Cornell University Press - 1966 (Introduction Page XIII).

اردو کے تعلق سے مختلف ماہرین نے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو زبان فارسی اور علاقائی اپ بھرنشاؤں کے رابطہ سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے۔ بیرونی حملہ آوروں کے ساتھ جب فارسی ہندوستان آئی تو شمالی ہندوستان میں قدیم سنسکرت اور بعد میں پراکرتوں کے زوال کے بعد اپ بھرنشائیں پیدا ہونے لگیں۔ ہندوستان کے لسانی منظر نامہ پر اپ بھرنشاؤں کا وجود اور ان کے ساتھ شمالی ہندوستان میں بیرونی حکمرانوں کی افواج کے ساتھ فارسی کا وروود ایک لسانی سنگم کی شکل اختیار کرتا ہے، کھڑی بولی اسی لسانی سنگم یا زبانوں کے باہمی رابطہ کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور اردو کے دوسرے ممتاز محقق و ماہر لسانیات نے بھی اردو کے آغاز کے تعلق سے انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مگر گیان چند جین اس نظریے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ استہزائیہ انداز میں لکھتے ہیں: اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ زبانوں کے ارتقا میں دو زبانوں کے ربط سے تیسری زبان کے جنم لینے کا تصور غلط ہے۔ ممکن ہے، جین صاحب کے فرمودات صحیح ہوں، لیکن جب ہم اس موضوع کے ماہرین کی کتابوں سے رجوع کرتے ہیں تو تصویر کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ دو لسانیت کا مشہور امریکی ماہر لسانیات یوریل وائنرخ (Urial Weinreich) اپنی مشہور کتاب Languuage in Contact میں لکھتا ہے۔

"Some Situations of language contact have been productive of new third Languages, while others have not"

سنسکرت ہندوستان کا ایک عظیم لسانی اور تہذیبی ورثہ ہے۔ زبان و ادب ہی نہیں بلکہ سیاسی نظریات، فلسفیانہ افکار، سائنسی بصیرت سنسکرت کے داخلی عناصر ہیں۔ سنسکرت ہندوستانی زبانوں کے درمیان ایک جوڑنے والی کڑی ہے۔ ہندوستان کی جدید ہند آریائی زبانیں ہوں، چاہے دراوڑی زبانیں ہوں، سنسکرت نے ان ساری زبانوں کو

متاثر کر کے انہیں آپس میں مربوط رکھا ہے۔ سنسکرت ہندوستانی لسانی زندگی میں ایک ریڑھ کی ہڈی کی طرح پیوست ہے۔ سنسکرت کا رشتہ صرف ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی سرحدوں سے پرے بھی اس کے رشتے قائم ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کی دیگر زبانوں نے بھی سنسکرت کو بنانے اور سنوارنے میں حصہ لیا ہے۔ کاکا صاحب کالیکر نے اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے "دیو بھاشا" یا خدا کی زبان کیوں کہا جاتا ہے، جبکہ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ آریوں نے مختلف پراکرتوں کو شعوری طور پر آپس میں ملا کر صاف و شفاف سنسکرت بنائی۔ سنسکرت کے معنی ہیں مہذب، بنی سنوری زبان۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے سنسکرت آریاؤں کے عہد میں ایک طرح کا اسپرنتو (Esperanto) کا تجربہ تھا۔

سنسکرت کی لسانی اہمیت پر اور اس کے عالمی رشتوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کاکا صاحب لکھتے ہیں:

"Linguistics, grammar, phonetics, philology and semantics all acknowledge their debt to Sanskrit. In fact, it was only after te study of Sanskrit that the scholars of the world received a clear perspective of and direction for the study of languages. It is said that the greatest discovery of the last century in the field of linguistics was the establishment of an affinity between not only Sanskrit, Pehalvi and Avesta; but between Sanskrit, Latin and Greek. And now the whole range of the languages of Europe and South - East Asia have come under a comparative study. Even

the languages of northern Eurasia are yielding significant similarities with Sanskrit."

Sanskirt thus bids fair to be a common link for all the Eurasian languages barring perhaps the languages of the Mongol family. In India, Sanskrit is by far the most important influence which binds all the Indian languages, big and small, together. Bengali, Assamese, Oriya, Nepali, Marathi, Gujarati, Rajasthani, Sindhi, Punjabi, Kashmiri and Hindi - with all the innumerable dialects - in fact all the languages of Northern India are the direct descendants, the daughters of Sanskrit." (1)

اردو اور سنسکرت کے رشتے کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کاکا صاحب نے لکھا:

"Even Urdu with its Arabic - Persian script is replete with words of Sanskrit origin. It is not surprising that almost all the verbs in Urdu can trace their origin to the Sanskrit stock. After all, Persian is a near sister of Sanskrit. (2)

(1) Affinity of Indian Languages: The Publication Division Publication New Delhi - 1959. Article by Kaka Saheb Kalekar on the Link of Sanskrit. Page 30.

(2) Ibid. Page 31

گیان چند اپنی کتاب میں اردو پر فارسی، عربی کے اثرات پر نکتہ چیں ہیں، انہوں نے بار بار اردو کو فارسی کے اثرات کی وجہ سے اپنے درشت اور طنز آمیز کلام کا نشانہ بنایا ہے اور سنسکرت زبان سے دوری کی شکایت کرتے رہے ہیں۔ لیکن فارسی کے حوالے سے اردو کو تنقید کا نشانہ بناتے وقت انہوں نے اس بات کو نظر انداز کیا (دانستہ یا نادانستہ) کہ سنسکرت اور قدیم فارسی میں بہناپا ہے۔ دونوں آریائی زبانیں ہیں، دونوں کی اصل ایک ہے، ایک نے ایران میں پرورش پائی اور ایرانی یا فارسی کہلائی، دوسری نے ہندوستان آباد کیا اور سنسکرت کہلائی۔ اعضائے جسم کے نام سنسکرت اور فارسی میں صوتی تبدیلی کے ساتھ ایک ہیں، رشتہ داری کی اصطلاحیں ایک ہیں اور اس طرح مختلف سطحوں پر الفاظ میں باہم اشتراک ہے۔ اردو میں فارسی الاصل الفاظ سے جو سنسکرت کے حوالے سے متحد الاصل (Cognates) ہیں، میل جول آسان تھا۔ اردو نے ان الفاظ کو جلد جذب کر لیا۔ ترک بھی اپنی ترکی کے ساتھ ہندوستان آئے لیکن ترکی اردو کو اس طرح متاثر نہیں کر سکی جس طرح فارسی نے کیا۔ لسانیات کا یہ اہم نکتہ ہے کہ ایک ہی خاندان کی زبانیں ایک دوسرے سے آپس میں جلد گھل مل جاتی ہیں۔ فارسی ہند آریائی / ایرانی زبان ہے۔ جس کی وجہ سے اس نے نہ صرف اردو کو بلکہ دیگر ہندوستانی زبانوں مثلاً پنجابی، سندھی، مراٹھی، گجراتی اور بنگالی وغیرہ پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔ ترکی ایک الگ خاندان التائی سے تعلق رکھتی ہے، لہٰذا وہ اردو کو صرف چند الفاظ کے علاوہ متاثر نہ کر سکی۔ رگ وید اور ژند اوستا میں جو لسانی ہم آہنگی ہے اور جو اشتراک پایا جاتا ہے وہ تہذیبی و لسانی تاریخ کا اہم نکتہ اتصال ہے۔ مارٹن ہاگ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ برہمنوں اور پارسیوں کی زبان سے نکلے ہوئے مقدس نغمے ایک ہی زبان کی دو بولیاں ہیں، جو ایک ہی قبیلے یا قوم سے تعلق رکھتی ہیں:

"The Language of the sacred songs of the Brahmans and that of Parsees are nothing but two dialects of two or more tribes of one and the same nation." (1)

گیان چند جین صاحب کی فارسی عربی کے اردو پر اثرات کی شکایت بجا لیکن یہ ایک تاریخی عمل ہے۔ جس زمانے میں ہندوستانی زبانوں اور خصوصاً اردو پر فارسی عربی کے یہ اثرات نقش ہوئے وہ ارادتاً نہیں بلکہ تاریخ کا فطری تقاضہ تھے۔ ہندوستان میں آریوں کی آمد سے پہلے ملک کی لسانی اور تہذیبی صورت کیا تھی؟ یہاں کی اصل زبان اور تہذیب پر آریوں کے اثرات تاریخ میں زیر بحث آئے ہیں۔ آریہ بھی ہندوستان میں نو وارد تھے، ان کے بیرونی اثرات نے ہندوستان کا لسانی اور تہذیبی منظر نامہ بدل دیا۔ یہی صورت حال بعد کے حملہ آوروں کے ساتھ بھی ہوئی، خصوصاً وہ لوگ جو مغل یا ایرانی تھے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ آریاؤں نے یہاں کے اصلی باشندوں کو اپنے علاقوں سے نکال باہر پھینکا اور خود قابض ہو گئے۔ مغلوں اور ایرانیوں نے یہاں کے باشندوں کو ملک بدر نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ گھل مل کے ان میں جذب ہو گئے۔ لسانی اعتبار سے بھی مسلم فاتحین نے یہاں کی زبانوں پر جور و ستم نہیں ڈھایا، انہیں اپنایا، خود بھی ان سے متاثر ہوئے اور انہیں بھی متاثر کیا۔ تاریخ کے ہر دور میں عالمی سطح پر یہی ہوتا آیا ہے۔ مسلمانوں کے حوالے سے مبالغہ آمیز انداز سے ان باتوں کو بیان کرنا، خاص طور پر سیاسی اعتبار سے، فرقہ وارانہ مخدوش حالات میں، غیر ذمہ دارانہ رویہ ہے۔ بیرونی زبانوں کے اثرات لسانی مطالعہ کا موضوع ہیں تضحیک کا نہیں۔ انگریزی پر ہندوستانی زبانوں کے اثرات پر ایک سکالر ڈاکٹر سبرا منیم نے تحقیقی کام Indian Loans in English کے نام سے کیا ہے۔ انگریزی پر ہندوستانی زبانوں کے اثرات سے زبان پر

(1) Martin Hang: Essays on the Sacred Language, Writings and Religion of the Parsees, Bombay, 1882.

مثبت اثرات ہوئے ہیں مخفی نہیں۔ اردو اور ہندی، مراٹھی اور گجراتی وغیرہ کے حوالوں سے فارسی کے اثرات پر بھی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ان سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ بقول سنیتی کمار چٹرجی:

> The influence of extra - Indian foreign languoges upon the languages of India is a fascinating topic in Indian linguistics, and it demonstrates how India became affected by foreign peoples in her culture, in the domains of both material objects and intellectual ideas. The indian people as a whole attained its completed indian character after the Aryans, as the latest ethnic and cultural element, arrived in India, and the Aryan language in its successive phases (with the Dravidian languages coming in later) gives the fullest expression to the Indian mind and Indian culture etc. The oldest records of India, which we can read either in the contemporary documents or in later manuscripts are all in Aryan: the Asoka inscriptions, the texts of the Vedas, the Brahmanas, the Mahabharata, the Puranas, etc. The earliest Indian records as in the Harappa and Mohen - jo - Daro seals have not yet been deciphered and interpreted. The character of their language, whether it was Aryan or Dravidian, or some other, still remains an enigma, though it is likely that it was some form of Proto - Dravidian."(1)

(1) Common Foreign Borrowings by Dr. S.K. Chatterji, in Affinity of Indian Language, the Publication Division, New Delhi, 1959 Page. 24.

گیان چند لکھتے ہیں:

''مشکل یہ ہے کہ اردو کی قدیم تاریخ کو جاننے کے لیے عربی فارسی نہیں ، پراکرت اور اپ بھرنش سے واقفیت چاہیے، اگر براہ راست نہیں تو کم از کم ہندی میں جو مواد ملتا ہے اس سے تو استفادہ کرلیں۔ لیکن بیسویں صدی کے نصف اول کی اردو تحریک نے ہندی زبان اور قدیم تحریروں کی محض تضحیک کرنا سیکھا۔''

(ص ٦٦)

مجھے یہ اعتراف ہے کہ اردو کے عام سکالر پراکرت اور اپ بھرنش سے واقف نہیں ہوتے اور کم از کم چند کو جو تاریخی لسانیات سے دلچسپی رکھتے ہوں سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش جاننی چاہیے۔ یہ شرط صرف اردو والوں کے لیے نہیں ہندی والوں کے لیے بھی ہے، جو ان سے اردو والوں کی طرح ہی ناواقف ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہندی کا سوال ہے اردو والے سرکاری زبان ہندی سے قریب ہیں اور ہندی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ گیان چند عربی وفارسی جاننے کو ضروری نہیں سمجھتے ، اگرچہ ان کا جاننا بھی ضروری ہے۔ ہندی والوں کو تو عربی فارسی سے قطعاً مس نہیں ہے، لہٰذا دکنی اردو کو ہندی کا جامہ پہناتے ہوئے ایسی فاش غلطیاں نہ کرتے جس کے وہ مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ گیان چند کی زیر نظر کتاب، تنقید برائے تنقید کی اندھی کوششیں ہیں اور یہ منصوبہ بند تنقید ہے۔ انگریزی محاورہ کے مطابق اسے Witch hunting agenda سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

گیان چند صاحب اردو والوں کی فارسی دانی (جسے اب نظر بد لگ گئی ہے) سے ناراض ہیں اور اس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب میں بارہا کیا ہے۔ سنسکرت اور فارسی کا گہرا لسانی وتہذیبی رشتہ ہے۔ یہ ایک ہی خاندان کی دو زبانیں ہیں اور فارسی کے

بے شمار الفاظ فارسی اور سنسکرت کے مشترک الفاظ ہیں۔ میں اپنی یہ گفتگو ایک واقعہ پر ختم کروں گا جسے ہمارے ممتاز سیاسی رہنما تحریک آزادی کے جانباز سپاہی اور دانشور پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی کتاب تلاش ہند (The Discovery of India) میں بیان کیا ہے۔ پنڈت نہرو لکھتے ہیں:

"Two months ago the leader of an Iranian Cultural Mission to india said in the city of Allahabad: 'The Iranians and Indians are like two brothers who, according to a Persian legend, had got separated from each other, one going east and the other to the west. Their families had forgotten all about each other and the only thing that remained in common between them were the snatches of a few old tunes which they still played on their flutes. It was through these tunes that, after a laps of centuries, the two families recognized each other and were reunited. So also we come to India to play on our flutes our age - old songs, so that, hearing them, our Indian cousins may recognize us as their own and become reunited with their Iranian cousins." (1)

---

(1) Nehru Jawaharlal: The Discovery of India. Page 116.

(۲)

ہندوستان کو، یہاں کے لوگوں کو اور یہاں کی تہذیب کو سمجھنے کے خیال سے مسلمانوں میں سب سے پہلے البیرونی نے یہاں کی زبان سنسکرت کو سیکھنا ضروری سمجھا۔ البیرونی کا انتقال ۱۰۴۸ء میں ہوا۔ اس نے سنسکرت سے عربی اور عربی سے سنسکرت میں کتابوں کے ترجمے کیے اس کی دو کتابیں غرۃ الزیجات (Ghurratul Zijat) علم نجوم سے تعلق رکھتی ہے جو سنسکرت میں کرنا تلک (Karna Tilak) کی علوم نجوم (Astrology) پر کتاب کا عربی ترجمہ ہے۔ اصل سنسکرت کتاب تاریخ کے دبیز پردوں میں کھوگئی ہے اور اصل کتاب کا کہیں پتہ نہیں چلتا، صرف اس کا عربی ترجمہ باقی ہے۔

البیرونی کی دوسری کتاب "پتنجلی الہندی (Batanjali - ul - Hindi) ہے۔ یہ پاتنجلی کی مشہور "یوگ سترا" (Yog Sutra) کا عربی ترجمہ ہے۔ استاد احمد لاہوری کے بڑے بیٹے عطا، اللہ راشدی نے بھاسکر اچاریہ کی ریاضی (Mathematics) کی مشہور کتاب۔ وجگنتا (Vijganita) کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۳۵-۱۹۳۴ء میں کیا گیا جو شاہ جہاں کے نام سے معنون ہے۔ شہنشاہ اکبر کے نورتن فیضی نے ریاضی کی کتاب لیلا وتی کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ فیضی کا انتقال ۱۵۹۵ء میں ہوا۔ اسی طرح ایک نام قاضی رکن الدین سمرقندی (وفات ۱۲۱۸ء) کا بھی ہے۔ قاضی رکن الدین بنگال میں رہتے تھے، انہوں نے یوگا (Yoga) کی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے ہندو سادھوؤں سے ربط ضبط بڑھایا اور سنسکرت کی کتاب "امرت کنڈ" (Amrit Kund) کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا جس کا نام حوض الحیات رکھا۔ یہ ایک طویل سلسلہ ہے۔ سنسکرت زبان کے عالم کی حیثیت سے دارالشکوہ کا نام زبان و ادب اور طریق فکر کی وجہ سے اہم ترین نام ہے جس نے فارسی میں تصوف اور بھگتی کے حوالے سے اور سنسکرت ماخذ کے حوالے سے مجمع البحرین (Mingling of Ocean's) لکھی۔ ہندوستان میں فارسی اشرافیہ کی زبان تھی اور علمی دلچسپی کے تحت فارسی میں سنسکرت ادب العالیہ (Classics) کے

ترجمے کیے گئے۔ اس کا ایک مقصد ہندوستانی علوم، طرزِ فکر اور ادب و فلسفہ سے واقف ہونا اور واقف کرانے کے لیے عام و خاص میں افہام و تفہیم اور دلوں کو جوڑنا تھا۔ صوفیا کا طریق تعلیم بھی محبت اور بھائی چارہ کی تعلیم دینا تھا۔ وہ قینچی سے نہیں بلکہ سوئی کے استعمال پر زور دیتے تھے کہ قینچی کاٹتی ہے اور سوئی جوڑتی ہے۔ مغلوں کا عہد علمی اور انتظامی اعتبار سے فارسی کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہندوستان میں فارسی کے زوال کے بعد ہندوستانی یا اردو نے فارسی کی وراثت سنبھالی جو یہاں کے عام لوگوں میں بول چال کی زبان کی حیثیت سے ترقی کر رہی تھی اور شعر و ادب کی زبان کی حیثیت سے بھی مقبول ہو رہی تھی۔ اردو زبان کے ابتدائی عہد میں کئی شاعر اردو کے ساتھ علاقائی زبانوں میں ہی نہیں بلکہ اردو کے ساتھ سنسکرت میں بھی شاعری کرتے تھے۔ تذکروں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں مثلاً دورِ اول کے کئی اردو شاعر اردو کے ساتھ سنسکرت میں بھی شاعری کرتے تھے۔ اس طرح اردو میں دو لسانی شاعری کا رواج تھا اور جس طرح ہندو فارسی پڑھتے تھے مسلمان بھی سنسکرت سے واقف ہوا کرتے تھے۔ ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' جسے خان آرزو نے ''نوادر الالفاظ'' کے نام سے مدون کیا، فارسی، سنسکرت اور اردو کے متحد الاصل یا ایک ہی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں کا لغت ہے۔ فارسی کے زوال کے بعد اردو ایک مشترکہ بیان کی حیثیت سے ابھری۔ یہ شمال میں ہی نہیں بلکہ جنوب میں بھی مشترکہ تہذیب Common Cultural Heritage کی علامت تھی۔ یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں تھی بلکہ یہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک مشترکہ میراث تھی۔ جنوبی ہندوستان میں بشمول مہاراشٹر اور گجرات اس کا چلن تھا۔ عام ہندوستانی اٹھارویں اور انیسویں صدی میں عربی، فارسی اور سنسکرت سے دور ہو گئے تھے لیکن مذہبی تعلیمات کی اہمیت کل بھی باقی تھی اور آج بھی باقی ہے۔ لہٰذا عربی سے قرآن مجید کے اردو ترجموں کا دور شروع ہوا تا کہ مسلمان اپنی مقدس کتاب کو سمجھ سکیں۔ اسی طرح ہندو مذہب کے ماننے والوں کے لیے جو سنسکرت سے ناواقف تھے اور اردو جن کی عام بول چال اور

سوچنے سمجھنے کی زبان تھی ان کے لیے ہندو مذہب کی مقدس کتابوں، وید، اپنشد، رامائن اور مہا بھارت اور گیتا کے ترجمے کیے گئے تا کہ وہ اپنے مذہبی ورثے سے واقف رہیں اور ان کی تعلیمات کی روشنی ان کے دل و دماغ میں جگمگاتی رہے۔ چنانچہ اردو میں ہندو مذہب کی مقدس کتابوں کا دور شروع ہوا کہ عام اردو بولنے اور لکھنے والے ہندوؤں کی علمی اور مذہبی ضرورت بھی پوری ہوتی رہے۔ انیسویں صدی میں ہندو مذہب کے احیاء کی کئی تحریکیں ابھریں اور اس طرح اسلام کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کی ترویج و اشاعت کے لیے بھی اردو میں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے ترجموں کا دور شروع ہوا۔

اردو میں ہندی یا سنسکرت سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ہندوؤں کے مختلف فرقوں آریہ سماج، برہمو سماج، دیو سماج، رادھا سوامی مت، تھیوسوفیکل سوسائٹی نے متعدد ہندو مذہب سے یا ان فرقوں سے تعلق رکھنے والی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے اور اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اردو ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان ہے۔ آریا سماج کے مشہور رہنما لالہ لاجپت رائے نے اپنی کتاب ''مہاراج شری کرشن اور ان کی تعلیم'' جو ہندوستانی پریس، لاہور سے ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی، کے دیباچہ میں لکھا ہے:

''اردو حقیقت میں ہندوستان کی زبان ہے بلکہ اکثر موقعوں پر اردو اور ہندوستانی ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں''۔ پنڈت جنیشور پرشاد مائل دہلوی نے ''حسن اول'' میں جو جین، بودھ، ہندو مذہب اور ان کے فلسفہ اور اخلاقی تعلیمات سے تعلق رکھتی ہے لکھا ہے:

''اردو میری مادری زبان ہے۔ اس کی ترقی اور بہبودی کی کوشش کرنا ایک سعادت مند اولاد کی طرح میرا فرض ہے لہٰذا میں ہیچمدانی ہمت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ پرانے رشیوں اور مہاتماؤں کے باغ سے عمدہ عمدہ پھول چن کر لاؤں اور ان سے ایوان سجاؤں'' ...... مائل دہلوی کی طرح ایسے متعدد ہندو ادیب ہیں جنھوں نے اردو کا

ایوان ہندو دیومالا سے سجایا ہے جس کا اصل منبع سنسکرت زبان و ادب ہے۔ ہندو دیومالائی افکار کو اردو میں منتقل کرنے سے، اردو کے ذخیرہ الفاظ میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ وہ ساری کتابیں جو ہندو مذہب سے متعلق اردو میں لکھی گئی ہیں ان میں سنسکرت کی اصطلاحیں شامل ہے۔ جس طرح اسلامی تعلیمات کو پیش کرتے ہوئے عربی اور فارسی اصطلاحیں اردو میں استعمال ہوئیں، اسی طرح ہندو تعلیمات کو پیش کرتے ہوئے فطری طور پر سنسکرت اصطلاحیں استعمال ہوئیں۔ اس سے ہر دو طرف سے الفاظ اردو میں آئے اور زبان میں وسعت پیدا ہوئی۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی دلچسپ اور ضروری ہے کہ مسلم صوفیوں نے بھی جو بھگتی سے متاثر تھے، اپنی متصوفانہ کتابوں (Sufi Treatises) میں سنسکرت اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ اس طریقہ کار سے اردو زبان میں وسعت پیدا ہوئی اور اس کی قوت اظہار میں اضافہ ہوا کہ اردو زبان تمام تر حالات (Situations) کو سنبھال سکتی ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی عقائد کو عربی فارسی لفظوں کی مدد سے سمجھنا مشکل ہے، ایسے الفاظ کے معنیاتی افق مختلف ہوتے ہیں چنانچہ اردو ایک مشترکہ قومی تہذیب (Composite Indian Culture) کی زبان ہونے کی حیثیت وہی لفظ استعمال کرتی ہے جو ماخذ یا Source زبان یعنی سنسکرت کا حصہ ہیں۔ ہندوؤں کی سب سے مقدس کتاب وید ہیں۔ ویدوں کو آسمانی کتب سمجھا جاتا ہے۔ وید چار ہیں، لیکن سب سے پرانا وید، رگ وید ہے۔ ویدوں کے بعد اپنشد ہیں۔ اردو میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں اور ان ترجموں کے ذریعہ اردو اور سنسکرت کے ادبی رشتہ کو طاقت ملی ہے۔

ڈاکٹر محمد عزیز نے اپنی مشہور کتاب "اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ" (مطبوعہ ۱۹۵۵ء) میں لکھا ہے کہ:

"اردو میں ویدوں سے متعلق سب سے قدیم کتاب جو مجھے مل سکی وہ الکھ پرکاش ہے۔ اس کے سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے" خلاصہ چاروں بید، یعنی رگ وید، یجر وید،

سام وید اور اتھر وید کا اردو زبان میں ...... " یہ کتاب جون ۱۸۶۱ء میں الکھ دھاری عرف منشی کنہیا لال نے لکھی اور آگرہ سے شائع ہوئی۔ چاروں ویدوں کے منتروں کا خلاصہ باون (۵۲) اپنشد ہیں۔ داراشکوہ نے سر اکبر کے نام سے ان کا فارسی ترجمہ کیا تھا، الکھ پرکاش، اسی کا اردو ترجمہ ہے...... وید پر اردو میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، اس سلسلہ میں دوسری کتاب سوامی دیانند سرسوتی کی تفسیر رگ وید کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب "رگ وید آدی بھاشا بھومیکا" کے عنوان سے ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی۔

ویدوں کی طرح اپنشد کے بھی اردو میں ترجمے ہوئے۔ بقول پروفیسر عزیز:

"منشی سورج نرائن مہر دہلوی نے اپنشد کی شرح چار جلدوں میں لکھی جو ۱۹۱۷ء اور ۱۹۳۱ء میں دلی سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ بھی اپنشد کے اردو میں ترجمے شائع ہوئے اور اردو اور سنسکرت کے علمی و ادبی رشتے مضبوط بنائے گئے۔ یہ سلسلہ بھی تفصیل طلب ہے لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔ ویدوں کی تعلیمات پر بھی متعدد کتابیں اردو میں شائع ہوئیں۔ اس سلسلہ میں منشی سورج نرائن مہر دہلوی نے اردو میں ایک مذہبی رسالہ سادھو شائع کیا۔ اس رسالے میں سنسکرت کی مذہبی کتابوں کے اردو ترجمے بھی شائع ہوتے تھے۔ منشی سورج نرائن کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے اور ان پر مستقل کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح یوگ پر بھی کئی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئیں جن پر یوگ شاستر، سانکھ یوگ، یوگ درشن، راج یوگ، گیان یوگ اور اسی نوعیت کی متعدد سنسکرت کی مذہبی علمی و فلسفیانہ کتابوں کے ترجموں سے اردو زبان و ادب مالا مال ہے۔ اسی طرح بھگتی اور پورانوں پر مشتمل کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کیا جا چکا ہے۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ رامائن اور مہابھارت کے بھی ترجمے اردو میں موجود ہیں۔ مہابھارت کے ترجموں میں "مخزن مہابھارت" بابو جوالا پرشاد بھارگو نے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ "سری رام کرت مہابھارت" کا ترجمہ منشی سری رام کائستھ ماتھر

دہلوی نے کیا۔ ..... "گیتا" کا تعلق مہا بھارت ہی سے ہے۔ یہ ہندو مذہب کی تعلیمات کا ایک غیر معمولی شاہکار ہے۔ اسلامی تعلیمات یعنی قرآن اور گیتا میں جو مماثلتیں اور موضوعات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس کا مطالعہ پنڈت سندر لال نے اردو، ہندی اور انگریزی میں "گیتا اور قرآن" کے عنوان کیا ہے۔ اردو میں گیتا غالباً مقبول ترین کتاب ہے جس کے اسی (۸۰) کے قریب ترجمے موجود ہیں۔ بقول ڈاکٹر تارا چند بھگتی کا سب سے قدیم صحیفہ یا آسمانی کتاب "بھگوت گیتا" ہے۔ اس کا ہندوؤں کے مذہبی ادب میں بلند ترین مقام ہے اور اپنی تعلیمات کے لحاظ سے دوسری کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اردو نثر اور نظم دونوں میں اس کے بے شمار ترجمے ہوئے ہیں۔ یہ ترجمے ہندوؤں نے بھی کیے اور مسلمانوں نے بھی۔ مسلمان ادیبوں اور شاعروں میں غالباً سب سے پہلی بار خواجہ دل محمد نے "دل کی گیتا" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا اور بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر اور عالم و محقق ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے بھی اسے اردو میں منتقل کیا۔ یہ دونوں ترجمے نظم میں ہیں۔ چند سال قبل اس کا ایک ترجمہ اردو نثر میں حیدرآباد کے مشہور سکالر ڈاکٹر حسن الدین احمد نے بھی کیا۔ یہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (دلی) نے شائع کیا۔ مشہور اردو شاعر، عالم اور نقاد منشی کنہیالال عرف الکھ داری نے جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے "الکھ پرکاش" کے نام سے چاروں ویدوں کو اردو پڑھنے والوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ انھوں نے "گیان پرکاش" کے نام سے بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ پیش کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۶۳ء میں، اکبر آباد یعنی آگرہ سے چھپا۔ دوسرا ترجمہ منشی شیام سندر لال نے مطبع نول کشور لکھنو سے ۱۸۸۳ء میں بھگوت گیتا مع اردو ترجمہ شائع کیا۔ اور اس کی شرح یعنی ٹکا بھی لکھی۔ بھگوت گیتا کے اردو ترجموں کی تعداد جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے اسی (۸۰) سے زیادہ ہے۔

"سرچشمہ عرفان" کے نام سے گیتا کا ایک ترجمہ منشی جگن ناتھ پرشاد عارفؔ نے بھی کیا ہے جس میں ان کا ایک مفصل مقدمہ بھی شامل ہے جس میں ہندو علم الاصنام میں

آئی مذہبی اصطلاحوں (Religious Technical Terminology) کے معنی بھی دیئے گئے ہیں۔ لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک کی مشہور شریمد گیتا کا بھی اردو میں ترجمہ موجود ہے۔ کئی ترجموں میں اصل سنسکرت متن (Text) اور پھر اس کا اردو رسم الخط میں اصل روپ اور پھر ترجمہ اور تشریح بھی ہے۔ بھگوت گیت منظوم جس کا دوسرا نام "نسیم عرفان" ہے، مشہور اردو شاعر منور لکھنوی کا بھی ہے۔ اسی طرح گیتا کی اردو میں شرحیں یا ٹکائیں بھی لکھی گئی ہیں، جن میں سے ایک سورج نرائن مہر دہلوی کی ہے۔

مہابھارت کے بھی اردو میں ترجمے ہوئے ہیں، جن میں ایک بابو جوالا پرشاد بھارگو کا ہے جو چار جلدوں میں ہے۔ دوسرا "سری رام کرت مہابھارت" منشی سری رام کا سکھ ماتھر دہلوی کی یادگار ہے جو ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی۔ اسی طرح رامائن کے بھی اردو میں متعدد ترجمے ہوئے ہیں، جس میں والمیکی رامائن کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ یہاں تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ اس سارے بیان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اردو زبان اور سنسکرت میں ادبی سطح پر ترجموں کے ذریعہ لین دین یا آداں پرداں ہوتا رہا ہے۔ پنڈت برج نرائن چکبست کا "رامائن کا ایک سین" جدید اردو شاعری میں شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو ان کے مجموعہ کلام "صبح وطن" میں شامل ہے۔ اسی طرح پرانوں کا بھی ایک طویل سلسلہ ہے جو اردو میں ترجمہ ہو کر اردو اور سنسکرت کے ادبی رشتہ کو مضبوط کرتے ہیں۔ اردو کی طرح ترجموں کے ذریعہ یہ لسانی اور ادبی رشتہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ساتھ بھی قائم ہوا ہے۔ "منوسرتی" کے ترجموں سے بھی اردو کا دامن خالی نہیں ہے۔ اسی طرح ہندو فلسفہ و حکمت یعنی "درشن" پر بھی اردو میں ترجمے موجود ہیں۔

ادبی اعتبار سے سنسکرت کی مذہبی کتابوں کے علاوہ خالص ادبی نقطہ نظر سے اردو میں "بھرتری ہری" کے نثر اور نظم میں ترجمے ہوئے ہیں۔ اس کا پہلا ترجمہ ۱۹۰۱ء میں اردو میں ہوا، پھر ۱۹۱۳ء میں بابو گوری شنکر اختر نے اس کا اردو نثر میں ترجمہ کیا، بھرتری

ہری کا ترجمہ کرنے والوں میں ہندو اور مسلمان شاعر اور ادیب دونوں شامل ہیں۔ اقبالؔ نے بھرتری ہری کے اشلوک کو اردو میں کمال فنکاری کے ساتھ ترجمہ کر کے ایک مثال قائم کردی۔ اقبال کا یہ مشہور شعر جو ان کے مجموعہ کلام ''بال جبریل'' کے سرنامے یا (Title Cover) پر لکھا ہوا ملتا ہے وہ ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اقبال بھرتری ہری سے بے طرح متاثر تھے اور بھرتری ہری کی شاعری کے اثرات ان کی شاعری میں نفوذ کیے ہوئے ہیں۔ مذکورہ شعر کے حوالے سے سنسکرت اور بھرتری ہری سے اردو کا تعلیم یافتہ حلقہ واقف ہے اور اسی سے انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ سنسکرت زبان وادب ہندوستانی زبانوں میں اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں۔ اقبال نے نہ صرف بھرتری ہری کو اردو والوں میں زبان زد خاص و عام کیا بلکہ رگ وید کے مشہور اشلوک ''گایتری منتر'' کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ اقبالؔ کی بانگ درا کی نظم ''آفتاب'' اسی گایتری منتر کا ترجمہ ہے۔ اقبالؔ سنسکرت زبان وادب کے رسیا یا مداح تھے۔

اقبال کا لسانی شعور صرف اردو ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ فارسی اور عربی کے ساتھ سنسکرت پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ وہ ہندوستانی کلاسیکی روایت سے پیوست تھے اور انہیں اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر و ناز تھا۔ ان کا نغمہ ہندی تھا اور لے حجازی تھی۔ انہیں اپنی ہندی وراثت پر ناز تھا۔ وہ ''برہمن زادہ ام'' اور ''اپنی برہمی، کف خاک'' پر بھی فخر کرتے تھے۔ اس پس منظر میں انہیں ہندوستان کی قدیم اور عظیم زبان سنسکرت سے بھی لگاؤ تھا اور کسی حد تک اس میں درک رکھتے تھے۔ عظیم سنسکرت شاعر بھرتری ہری ان کے ممدوح تھے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

''جاوید نامہ'' میں وہ اپنے ممدوح سے آسمان قمر پر ملتے ہیں اور ان سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کی اعلیٰ شاعری کا راز جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبالؔ کی سنسکرت

سے دلچسپی صرف بھرتری ہری تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ سنسکرت کے اعلیٰ و ارفع ادب سے بھی خوب واقف تھے اور سنسکرت کی لسانی وسعت اور جمالیات کا بھی انہیں اعتراف تھا۔ زبان سے واقفیت کے بغیر یہ اعتراف ممکن نہیں۔ وہ ''گیتا'' کے الوہی نغمے کو اردو میں منتقل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

''سرکار نے میرا ترجمہ ''گایتری'' پسند فرمایا۔ میرے لیے یہ بات سرمایہ فخر و امتیاز ہے۔ افسوس کہ سنسکرت الفاظ کی موسیقیت اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتی۔ بہر حال غالباً اصل کا مفہوم اس میں آ گیا ہے۔ زمانے نے مساعدت کی تو ''گیتا'' کا اردو ترجمہ کرنے کا قصد ہے۔ فیضی کا فارسی ترجمہ حضور کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ فیضی کے کمال میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ مگر اس ترجمے میں اس نے ''گیتا'' کے مضامین اور اس کے انداز بیان کے ساتھ بالکل انصاف نہیں کیا، بلکہ میرا تو یقین ہے کہ فیضی ''گیتا'' کی روح سے نا آشنا رہا''...... افسوس ہے کہ اقبال اردو میں گیتا کا ترجمہ نہیں کر سکے، لیکن ان کی نیت، مزاج اور اعلیٰ ظرفی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر اقبال اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو اردو، فارسی ادب کو یہ ایک یادگار تحفہ ہوتا۔

بھرتری ہری کے بعد اردو میں کالی داس کے ڈراموں سے نہ صرف دلچسپی کا اظہار کیا گیا بلکہ کالی داس کے اردو میں تراجم کے سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ہندوستانی زبانوں میں کالی داس کے شاہکار ڈرامے ''ابھگیان شکنتلا'' کا ترجمہ مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے زمانے یعنی فرخ سیر کے زمانے میں برج بھاشا میں ''نواز'' نے کیا۔ اردو میں شکنتلا کا اولین ترجمہ فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں اس عہد کے مشہور ادیب کاظم علی جواں نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ نثر میں تھا۔ اس کے بعد دوسرا ترجمہ سید محمد تقی نے ''رشک گلزار'' کے نام سے کیا۔ ایک ترجمہ پریم چند کے ہندی مترجم اقبال ورما سحر ہتگامی نے ''مثنوی سحر'' کے نام سے کیا۔ پھر اسی ڈرامے شکنتلا کا ترجمہ مشہور ترقی پسند افسانہ نگار اور عالم ڈاکٹر

اختر حسین رائے پوری نے کیا۔ اختر حسین رائے پوری خود سنسکرت زبان و ادب سے واقف تھے اور یہ ترجمہ بالراست سنسکرت سے ہے۔☆

یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا ۱۹۶۰ء میں اس سنسکرت شاہکار کا منظوم ترجمہ اردو کے مشہور شاعر ساغر نظامی نے کیا۔ اس کا پیش لفظ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا تھا۔ بیگم قدسیہ زیدی نے بھی اس کا سلیس اور سادہ ترجمہ کیا۔ اسے انجمن ترقی اردو، علی گڈھ نے شائع کیا۔ ساغر نظامی کا ترجمہ پنڈت نہرو نے پسند فرمایا تھا اور اس ترجمہ کی داد دی تھی۔ ڈاکٹر تاراچند اور مشہور ترقی پسند رہنما و ادیب سجاد ظہیر نے بھی ساغر کے اس ترجمہ کو سراہا تھا۔ پھر ان تمام ترجموں کے مدنظر منور لکھنوی نے پھر اسے سنسکرت سے اردو میں نظم کیا۔ منور لکھنوی نے کمار سمبھو اور مدرا راکشش کا بھی اردو ترجمہ کیا۔ شکنتلا کے ترجمہ کے بارے میں منور لکھنوی نے لکھا ہے:

> "میں نے کسی مقابلہ و موازنہ کے خیال سے نہیں بلکہ محض اپنے شوق ترجمانی کے زیر اثر شکنتلا کو بھی اپنے دائرہ مصروفیت میں لے لیا۔ تقریباً ایک سال کے اندر یہ ترجمہ پورا ہوسکا۔ اس دوران میں طویل وقفے بھی حائل رہے، اس لیے اگر ان وقفوں کو شمار سے خارج کر دیا جائے تو یہ ترجمہ تقریباً چھ ماہ میں پورا ہوا۔"

منور لکھنوی کا یہ ترجمہ بقول خود آزاد ہے۔ اس میں اشلوکوں کا ترجمہ مختلف بحور اور اشعار میں کیا گیا ہے اور نثری مکالمے کا ترجمہ نثر میں کیا گیا ہے۔ اصل سے بغاوت یا گریز کہیں نہیں ہے۔ اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ ہند اور ممتاز ماہر تعلیم اور ادیب ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے خط مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۶۳ء میں "ابھگیان شکنتلا" کے اس ترجمے کو سراہا ہے۔ منور لکھنوی نے مدرا راکشس، کمار سمبھو، کے علاوہ نامکمل ترجمے رگھو نش اور بھوبھوتی کی کتاب مالتی مادھو کا بھی ترجمہ کیا تھا۔

☆ یہ ایک آزاد ترجمہ ہے اور کہیں کہیں adoptation ہے، جو عام اردو قاری کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو اور سنسکرت ادب میں ترجموں کے ذریعہ ادبی رشتے قائم تھے۔ مزید تلاش و جستجو کے بعد ایسے متعدد سنسکرت ادب کے اردو ترجمے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اردو میں ترجموں کی ایک جاندار روایت رہی ہے۔ زبانیں ترجموں کے ذریعہ مالدار ہو جاتی ہیں اور ان زبانوں کے افق روشن ہو جاتے ہیں۔ اردو میں سنسکرت کے ترجموں کی اس روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ماضی میں اردو اور سنسکرت دونوں زبانیں جاننے والے عالم اور ادیب موجود تھے۔ اس روایت کی غیر موجودگی میں ہندی یا انگریزی ترجموں سے بھی استفادہ کر کے سنسکرت سے اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں ترجمے کرنا سود مند ہوگا۔ سنسکرت ایک ہند آریائی زبان ہے جو شمالی ہندوستان میں بولی جانے والی اکثر زبانوں کی ماں ہے۔ اردو بھی سنسکرت ہی کی بیٹی ہے جس طرح ہندی، مراٹھی، گجراتی، پنجابی، بنگالی اور سندھی وغیرہ دیگر زبانیں ہیں۔ ان میں لسانی اور ادبی رشتوں کو مضبوط کرنا ہمارا فرض ہے۔ سنسکرت زبان و ادب ہمارا عظیم تہذیبی و فکری ورثہ ہے۔ اردو نے سنسکرت کا دودھ پیا ہے، اس کی اصل سنسکرت میں چھپی ہوئی ہے۔ اردو زبان کی قواعد سنسکرت پر قائم ہے۔ اس کے جملوں کی ساخت (Sentence Structure) سنسکرت کا ورثہ ہے۔ اور اس کے ذخیرہ الفاظ (Vocabulary) کا ۶۰ فیصد حصہ سنسکرت پر مشتمل ہے۔ باقی ۴۰ فیصد اردو کی لفظیات (Diction) فارسی اور عربی کی دین ہے، لیکن یہ یاد رہنا چاہیے کہ خود سنسکرت اور فارسی حقیقی بہنیں ہیں، ان کی اصل ایک ہے۔ ایران میں ایک ہی آریائی زبان ایرانی یا فارسی بنی اور یہی زبان ہندوستان میں سنسکرت بنی۔ ایک چینی سیاح نے ان دونوں کو ایک ہی آلہ موسیقی سے نکلے ہوئے دو سُر کہا ہے۔ اس لحاظ سے فارسی کی لفظیات معمولی صوتی تغیر کے ساتھ سنسکرت ہی سے تعلق رکھتی ہے اور دونوں میں اشتراک ہے۔

فارسی تو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے ایران اور وسطی ایشیا میں زندہ ہے لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان میں سنسکرت اور فارسی جاں کنی کے عالم میں ہیں۔ سنسکرت کو

سکولوں کالجوں میں اور یونیورسٹیوں میں کم از کم علمی زبان کی حیثیت سے زندہ رکھنا چاہیے۔ ہمارے کالجوں اور سکولوں سے یہ زبانیں ختم ہو رہی ہیں اور ان زبانوں کے قتل کی ذمہ دار ہماری حکومتیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز غیر علمی (Unacademic) لوگ ہیں جو ہمارے تہذیبی ورثے سے ناواقف ہیں یا غفلت برتتے ہیں۔ بمبئی اور مہاراشٹر کے بیشتر سکولوں اور کالجوں سے سنسکرت کے شعبے بند کر دیے گئے ہیں اور اسی طرح فارسی کے بھی۔ یہ ہمارا تہذیبی المیہ (Cultural Tragedy) ہے۔ طلبا چاہے کم ہی کیوں نہ ہوں سنسکرت و فارسی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ سائنس کمپیوٹر، ٹیکنالوجی، یہ سب بہت اہم ہیں لیکن تاریخ، سماجیات اور زبانوں کے مطالعے بھی اچھی تہذیبی زندگی کے فروغ اور ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ زبانوں کے مطالعوں سے بے التفاتی یا انہیں نظر انداز کرنے کا جو رجحان ہمارے ہندوستان میں پیدا ہو گیا ہے، یہ تہذیبی خودکشی (Cultural Sucide) کے مترادف ہے۔ ہندوستان میں سنسکرت اور فارسی کی علمی اور تاریخی و تہذیبی اعتبار سے کل بھی اہمیت تھی اور آج بھی اہمیت ہے، حکومت کے ایوانوں میں (Government Corridors) میں اس بات پر غور کرنا ضروری ہے اور علمی حلقوں میں اس کے لیے تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔

گیان چند جین صاحب نے اردو کے فارسی اور سنسکرت سے مذکورہ رشتے اور اس کی لسانی وسعت پر غور نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کی تحریر گمراہ کن بن گئی ہے۔

☆......☆......☆

آٹھواں باب

ایک زبان اور دو رسم الخط اردو ہندی کے پس منظر میں

اردو اور ہندی ہندوستان کی دو اہم ترین زبانیں ہیں جن کا تعلق کھڑی بولی سے ہے، یوں سمجھ لیجیے کہ یہ دونوں زبانیں اب کھڑی بولی کے دو اسالیب ہیں جو انیسویں صدی کے ربع آخر سے ساتھ ساتھ پروان چڑھتے گئے اور ساتھ ساتھ آج بھی ارتقا پذیر ہیں۔ لیکن جب کھڑی بولی کا آغاز اور ارتقا شروع ہوا تو جو اسلوب سب سے پہلے نکھر کر ابھرا وہ اردو کا اسلوب تھا اور اسی اسلوب میں ادب بھی لکھا جانے لگا۔ لہٰذا قدامت کے لحاظ سے اردو کو ہندی پر اولیت حاصل ہے۔ گریرسن نے اپنے مشہور جائزہ زبان ہند میں اردو کی تاریخی اولیت اور اس کی قدامت کو تسلیم کیا ہے۔ ہندی کے سکالروں نے بھی کبھی کبھی اردو کی قدامت کا اعتراف کیا ہے۔ اردو کے آغاز میں اور کسی بھی زبان کے آغاز میں رسم الخط ثانوی حیثیت رکھتا ہے، لیکن جوں جوں زبانیں ارتقا پذیر ہوتی ہیں وہ اپنے تاریخی اور سماجی پس منظر میں کسی مروجہ رسم الخط کو اپنا لیتی ہیں۔ اردو کا آغاز گیارہویں اور بارہویں صدی میں ہوا۔ ابتدا میں یہ بول چال کا ذریعہ تھی، مگر جب اس میں توانائی آتی گئی تو ان لوگوں نے جو فارسی۔ عربی کی لسانی روایت بشمول رسم الخط سے تعلق رکھتے تھے، اپنے جذبات اور خیالات کو اردو رسم الخط میں محفوظ کیا اور ان لوگوں نے جن کی لسانی روایت سنسکرت کے حوالے سے دیوناگری سے جڑی ہوئی تھی، اسے

دیوناگری رسم الخط میں محفوظ کیا، لیکن اس کی اصل کھڑی بولی ہی رہی۔ امیر خسرو اور ان کے معاصرین صوفیا کے (۱) ملفوظات اور رسالے اردو رسم الخط میں ہیں اور سنتوں کے الوہی نغمے جو کھڑی بولی کا نمونہ ہیں، دیوناگری میں محفوظ ہیں۔ دیوناگری رسم الخط میں کھڑی بولی کو محفوظ کرنے کے باوجود یہ کھڑی بولی عموماً سنتوں کے لیے اپنی علاقائی اپ بھرنشاؤں کے ساتھ یعنی اودھی، مراٹھی، گجراتی، برج، راجستھانی کے ساتھ ثانوی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اردو البتہ عموماً صوفیا کے لیے فارسی کے بعد، جو علمی زبان تھی، زبان اول کا درجہ رکھتی تھی۔ اودھی بھی ہند آریائی کی ترقی یافتہ زبان تھی۔ مسلمان شاعروں جیسے ملک محمد جائسی، ملا داؤد، عثمان اور قطبن وغیرہ نے اودھی کی اعلیٰ ترین شاعری کو عربی فارسی رسم الخط میں لکھا، لیکن تلسی داس نے اپنا اودھی کا شاہکار ''رام چرتر مانس'' دیوناگری میں لکھا۔ اس پس منظر میں صرف اردو اور ہندی ہی نہیں بلکہ اودھی بھی جو ہندی نہیں ہے، بلکہ آزادانہ، ترقی یافتہ زبان ہے اس کے بارے میں بھی ایک زبان اور دو رسم الخط کی بات کی جا سکتی ہے اور چونکہ ملک محمد جائسی ہوں یا تلسی داس ان کی زبان ایک ہونے کی وجہ سے اس بات میں صداقت بھی ہوگی۔

اردو اور ہندی اودھی کے برعکس علیحدہ علیحدہ سمتوں میں آگے بڑھیں اور ابتدائی کھڑی بولی کے ارتقا کے بعد آزادانہ سمت و رفتار اختیار کرتے ہوئے نہ صرف اسلوب بیان اور سماجی سیاق و سباق اور لسانی جمالیاتی نقطۂ نظر سے بلکہ ادبی اعتبار سے بھی مختلف راہوں پر گامزن رہیں۔ یہ مختلف راہیں سماجیاتی لسانیات کے نقطۂ نظر سے، اسلوبیاتی پس منظر میں اور ادبی اعتبار سے اور لکھاوٹوں کے اعتبار سے بھی اپنی اپنی شناخت رکھتی ہیں۔

(۱) ستمبر ۲۰۰۲ء کے اردو دنیا، نئی دلی کے شمارے میں پروفیسر گیان چند جین کا خط ڈاکٹر گوپی چند جین کا خط ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام شائع ہوا تھا۔ جس میں پروفیسر جین نے لکھا تھا کہ وہ ایک زبان اور دو لکھاوٹ کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ راقم الحروف کا یہ مضمون اسی خط کے ردعمل کے طور پر لکھا گیا تھا جو یکم اگست ۲۰۰۳ء کو انجمن ترقی اردو کے ہفت روزہ ''ہماری زبان'' میں شائع ہوا۔ (عبدالستار دلوی)۔

تاریخی اعتبار سے بھی اردو اور ہندی میں بُعد ہے، لہٰذا دونوں کو رسم الخط میں لکھی جانے والی ایک زبان قرار دینا سیاسی اور علمی فریب اور لسانی کذب ہے۔

زبان محض صوتیات اور صرف ونحو کا نام نہیں ہے۔ زبان ایک سماجیاتی عمل ہے اور جمالیاتی بھی اور زبان کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اردو اور ہندی کی لسانی خصوصیات، ان کی سماجی، لسانی حیثیت اور جمالیاتی کیفیات ان دونوں کو الگ کرتی ہیں۔ ان دونوں زبانوں میں جو مشابہتیں ہیں وہ مخصوص تاریخی پس منظر رکھتی ہیں۔ ورنہ دونوں کی شناخت جداگانہ ہے۔ یہ دونوں زبانیں چھوٹی بڑی بہنیں ہیں اور چھوٹی بڑی بہنوں میں مشابہت ہونے کے باوجود ان کا اپنا آزادانہ تشخص قائم رہتا ہے۔ صرف بڑی اور چھوٹی بہن کی بات نہیں دو جڑواں بھائی یا بہنیں بھی اپنی مشابہتوں اور عادات و اطوار میں یکسانیت کے باوجود ایک نہیں بلکہ دو علیحدہ شخصیتیں ہوتی ہیں۔ زبانوں کے تعلق سے ان کی آزادانہ شناخت کے لیے ادبیات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اردو اور ہندی ادب دونوں علیحدہ علیحدہ دو ادب ہیں۔ ہر زبان کا اپنا ادب ہوتا ہے۔ اردو ادب اور ہندی ادب دو زبانوں کے دو ادب ہیں نہ کہ ایک زبان کے دو ادب ہیں۔ مختلف زبانوں اور ادبیات کو اپنے دائرہ سیاست میں شامل کرنا، لسانی سامراجیت کا طریق کار ہے۔ اردو کی طرح، اودھی، برج، بھوجپوری اور راجستھانی بھی ہندی نہیں بلکہ الگ الگ زبانیں ہیں۔ اگرچہ رسم الخط ایک ہے۔ ہندی جو اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں نسبتاً کم عمر زبان ہے، (جس کے ابو الآباد بھارتیندو ہرش چندر ہیں) ہمیشہ قدامت کی تلاش میں، مذکورہ آزاد اور ترقی یافتہ زبان و ادب کو اپنا لینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ ابھی ہندی کا تشخص قائم نہیں ہوا اور اعلیٰ ادبی نمونوں سے وہ محروم ہے، لہٰذا اس نے خسرو، ملک محمد جائسی، ملا داؤد، ملا عثمان، مولانا قطبن ہی نہیں دکنی اردو کو بھی ہندی بنانا شروع کیا اور اب وہ اردو کے درپے ہے اور امرت رائے اور گیان چند جیسے اصحاب، اردو کی اپنی شناخت جو واضح ہے، "ایک زبان اور دو رسم الخط" کے نام

پر ختم کرنا چاہتے ہیں۔

اردو تو اردو رسم الخط ہی میں اپنے صوتی نظام، صرفی خصوصیات، اسلوب بیان اور لسانی جمالیات کی امین ہے اور اردو زبان وادب اور ہندی زبان وادب، اپنے اپنے رسم الخط میں، طرز اظہار میں اور ادب میں دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ اردو کے حوالے سے یہ اصرار کہ اردو ہندی کا اسلوب ہے، لسانی سیاست میں جس کا تعلق ہماری بھگوا سیاست سے میل کھاتا ہے۔ امرت رائے کی فرمائش پر میں نے انہیں پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کے وہ لیکچرس بھی بھیجے تھے جن میں انہوں نے اردو کو اصل زبان مانا تھا اور کہا تھا کہ "اصل زبان اردو ہے اور ہندی اردو کے جوتوں میں پاؤں رکھ کر چلنے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ کہ "اردو کی سرسبزی اور شادابی اور خوشبو ہندی کو دور دور تک نصیب نہیں۔" (دیکھئے India a Polyglot Nation and its Linguuistic Problems Visa Vis National Integration مطبوعہ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر، ممبئی) مگر افسوس کی بات ہے کہ امرت رائے نے اس کتاب کا حوالہ تک نہیں دیا اور نہ ہی اسے اپنی کتابیات میں جگہ دی۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ امرت رائے کی ساری تحقیق پہلے سے طے شدہ نتائج کو ثابت کرنے کی کوشش کا نتیجہ تھی، جس میں گیان چند جین صاحب کے اردو بیزار یا اردو دشمن سواد کو ہی استعمال کیا گیا اور علمی انصاف پسندی سے کام نہیں لیا گیا۔ ڈاکٹر گیان چند کی اردو تحقیق میں امتیازی حیثیت ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیقی کتابوں کے ذریعہ جن کا تعلق بیشتر اردو ادب سے ہے، اردو ادب کی گرانقدر خدمت کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان وادب ہی نے ان کے علمی قد کو اونچا کیا ہے، تاہم اردو زبان وادب سے ان کے اس پیشہ ورانہ تعلق کے باوجود اردو کے حوالے سے ان کے ذہن و دل صاف نہیں ہیں۔ اردو زبان وادب کا مشترکہ قومی تہذیب یعنی ہند اسلامی تہذیب سے رشتہ انہیں گوارا نہیں ہے اور خالصتاً زعفرانی ذہن کے ساتھ وہ اردو زبان پر اظہار خیال کرتے وقت غیر متوازن ہو جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت جین صاحب کے

بڑے بھائی ڈاکٹر موہن پرکاش کا تحقیقی مقالہ "اردو ادب پر ہندی کے اثرات" ہے جسے انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے شائع کیا تھا۔ یہ ایک اردو مخالف کتاب ہے۔ یہ کتاب اولاً اشاعت کی غرض سے جین صاحب نے راقم السطور کے پاس بھیجی تھی کہ اسے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع کروں۔ اس بڑے (فل اسکیپ سائز) کے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں تقریباً ہر باب میں پچیس تیس صفحات جین صاحب کے تحریر کردہ تھے، جو اردو کے خلاف تھے اور لہجہ خراب تھا۔ اشاعت کے تعلق سے جب میری جانب سے جواب نفی میں گیا تو یہ کتاب انجمن نے شائع کی۔ اصل مقالہ انجمن ترقی اردو کے دفتر میں یقیناً محفوظ ہوگا جس میں گیان چند جین صاحب کے تحریر کردہ صفحات شامل ہیں (اس زمانے میں زیراکس کا رواج نہیں تھا، ورنہ ان کا زیراکس رکھا جانا چاہیے تھا)۔ جین صاحب اخلاقیات تحقیق کے قائل ہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ تحقیقی اخلاقیات کے اب بھی قائل ہیں تو وہ میرے اس بیان کی ضرور تصدیق و توثیق کریں گے۔

ہندوستان میں اردو اور ہندی کے حوالے سے رسم الخط کا مسئلہ مصنوعی حیثیت رکھتا ہے، جس میں بدنیتی بھی شامل ہے۔ اسی طرح اردو کو ہندی کا اسلوب یا شیلی کہنا بھی اردو زبان کی قدامت کے پیش نظر جو مسلمہ حقیقت ہے، شرانگیزی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اور یہ نظر کرم صرف اردو ہی پر کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے کہ یہ فارسی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے؟ یا اس کے ذخیرہ الفاظ میں عربی و فارسی کے الفاظ ایک بڑی تعداد میں مستعمل ہیں، یا یہ کہ اس میں تلمیحات، اشارے اور کنائے اور علامتیں ہندوستانی ذخیرہ کے علاوہ ایک بڑی تعداد میں عربی اور ایرانی لسانی روایت کے زیر اثر استعمال ہوتی ہیں؟...... بادی النظر میں تو یہی وجہ معلوم ہوتی ہے اور اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس لسانی تعصب کے پیچھے مذہبی نارواداری اور تعصب کی کارفرمائی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ بنگالی اور میتھلی میں جو مشترک عناصر ہیں، اس کے

باوجود انہیں الگ الگ دو زبانیں اور دو ادب سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر میتھلی کے شاعر اور ادیب اور اس کے بولنے والے اسے ہندی کی بولی نہ مانتے ہوئے اس کی آزادانہ حیثیت منوا چکے ہیں؟ میتھلی والے اسے بنگالی کی بولی بھی تسلیم نہیں کرتے اسی طرح وہ اسے ہندی بھی نہیں مانتے بلکہ چند مماثلتوں کے باوجود اسے بنگالی یا ہندی کے برعکس ایک آزاد زبان مانتے ہیں، یہ سب کچھ سیاسی طاقت کے زور پر ہوتا ہے۔ یہی حال بنگالی اور اڑیا زبان کا بھی ہے جو اپنی مماثلتوں کے باوجود الگ الگ دو زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ ہندی کے مقابلے میں اردو اس سیاسی طاقت سے محروم ہے، اس کی وجہ وہی لسانی سے زیادہ مذہبی تعصب ہے، جو اردو زبان اور اس کے بولنے والوں اور چاہنے والوں کا مقدر بن چکا ہے اور پھر ہمارے ''پاک طینت و پاکباز'' زبان و ادب کے علما کی مشق ستم کا شکار ہے۔

بنگالی اور میتھلی یا بنگالی اور اڑیا کی طرح بڑی حد تک مماثلت اور افہام و تفہیم جنوبی ہندوستان کی زبانوں کنڑ، ملیالم، تلگو میں بھی پائی جاتی ہے۔ ان زبانوں میں مجہول دو لسانیت (Passive Bilingualism) پائی جاتی ہے۔ رسم الخط میں بھی مماثلت اور مشابہت ہے، لیکن کسی کو یہ کہنے کی جرأت و ہمت نہیں ہوتی کہ جنوبی ہندوستان کی یہ ممتاز اور ترقی یافتہ زبانیں کسی ایک زبان کے چار اسالیب ہیں۔ ان چار دراویڈی زبانوں کی مسلمہ حیثیت اور تشخص قائم ہے۔ اگر کوئی ایک کو دوسری پر فوقیت دے یا ''چار رسم الخط اور ایک زبان'' کہے تو ہندوستان سیاسی خلفشار سے دوچار ہو جائے گا۔ اردو جواب بڑی حد تک مسلمانوں کی زبان بنتی جارہی ہے اور غیر مسلم اس سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ اس کے پیچھے کوئی سیاسی طاقت نہیں ہے اور اسی لیے اس زبان و ادب کے ساتھ سیاست داں تو سیاست داں چند زبان و ادب کے ودوان بھی اس کھیل میں بلے بازی کرنے میں مصروف ہیں۔ اردو اور ہندی خالص علمی لحاظ سے دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ ان کے رسم الخط جدا جدا ہیں۔ ان کی سماجی لسانی نوعیت علیحدہ ہے اور لسانی

جمالیات مختلف۔ ان دونوں کے ادب بھی ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ میتھلی شرن گپت کی ''پنچوٹی'' اور ''یشودھرا'' اور جے شنکر پرساد کی ''کامائنی'' کو اردو والے نہیں سمجھ سکتے، اسی طرح ہندی والے غالبؔ و اقبالؔ کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کا عوامی لب ولہجہ، شاعرانہ حسن، زبان کی دروبست اور اس کی غنائیت کی وجہ سے یہ زبان ہندی کے مقابلے میں عام فہم اور دل پر اثر کرنے والی زبان ہے اور درپردہ ساری سیاسی مخالفتوں کے باوجود عوام الناس کے دلوں کے قریب ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین اردو کے اچھے غزل گو شاعر بھی ہیں، ان کی غزلیں ہندی والوں کے بھی دل سے قریب ہوں گی۔ تو اردو اور ہندی کے دو ادب تسلیم کرنے کے بعد انہیں ایک زبان کہنا علمی دیانت داری نہیں ہوگی، یہ صرف سیاسی بازی گری اور لسانی اور مذہبی منافرت کے دائرہ کار کا حصہ بن جاتی ہے۔

کرسٹوفر آر۔ کنگ کی کتاب ''ایک زبان: دو رسم الخط'' (One Language: Two Scripts) کا سلسلہ فورٹ ولیم کالج کی سیاسی منافرت یعنی نفاق ڈالو اور حکومت کرو کی ایک توسیع یافتہ صورت ہے۔ عام طور پر انگریز یا امریکی سکالر کے یہاں غیر یورپی زبانوں اور کلچر کے حوالے سے تنگ ظرفی ہے۔ وہ اپنے مخصوص محدود دائرے میں سوچتے ہیں، انہیں نہ اردو سے پیار ہے نہ ہندی عزیز ہے۔ انہیں نفاق گیرو مسلمان زیادہ عزیز ہے۔ کرسٹوفر کنگ کے لسانی نظریات کو اسی سیاسی پس منظر میں دیکھا جائے، جس کا نقطہ آغاز فورٹ ولیم کالج میں اردو اور ہندی کی تقسیم سے شروع ہوا۔ انگریز، امریکی یا کسی یورپین سکالر کا فرمایا ہوا ہمیشہ مستند نہیں ہوتا۔ فرانسیسی اور اطالوی یا ہسپانوی زبانوں میں بھی بڑی مماثلت ہے۔ ان میں بھی بڑی حد تک مجہول دولسانیت (Passive Bilingualism) موجود ہے، مگر ان یورپی زبانوں کے حوالے سے ایک رسم الخط اور ایک زبان کی بات شاید کبھی نہیں کہی گئی۔ ان زبانوں کو ایک رسم الخط (رومن) کے باوجود الگ الگ زبانیں اور الگ الگ ادب ہی سمجھا گیا۔ یورپی تہذیب اور فکر اور

رہن سہن مجموعی حیثیت سے ایک ہے لیکن ان کی زبانوں کی آزادانہ شناخت ہے۔ ہندی اور اردو کی تہذیبی میراث الگ الگ ہے۔ ہندی کا تمام تر رجحان ہندومت کی طرف ہے، اردو مشترکہ تہذیب کی امین ہے نہ ہندو ہے نہ اسلامی ہے۔(1)

کرسٹوفر کنگ کی کتاب کا جہاں تک تعلق ہے، اس کا تعلق لسانیات سے زیادہ اردو اور ہندی کے سیاسی قضیے کی دستاویز کا ہے، اردو کے بمقابلہ جب انگریزوں کی ایما پر ناگری رسم الخط میں سنسکرت کے لفظوں کی کثیر تعداد میں ہندی کو لا کھڑا کیا گیا، تو یہ نزاع متعدی بیماری کی طرح شمالی ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی۔ انگریزوں کی نفاق ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت انگریزوں نے اس ضمن میں اہم رول ادا کیا۔ یوپی کے گورنر میکڈونلڈ نے اس سلسلے میں اپنے سیاسی مقاصد کے تحت دونوں فرقوں کو آپس میں برسرپیکار کیا۔ یہ صورت دیگر ریاستوں میں بھی رہی اور مقدمہ در مقدمہ اردو اور ہندی کے حق میں ان دونوں زبانوں کے چاہنے والے عدالتوں کا رخ اختیار کرتے رہے۔ یہ نزاع علمی اور لسانی نزاع نہیں بلکہ سیاسی نزاع تھی جسے حکومت وقت ہوا دیتی رہی۔ کرسٹوفر کی کتاب اسی سلسلے کی عدالتی کارروائیوں کی تاریخی دستاویز ہے اور اردو اور ہندی کے تقابلی اور علمی مطالعے کے سلسلے میں قطعی غیر اہم ہے۔ عدالتی کارروائیاں جو بھی رہی ہوں اور عدالتوں میں چاہے ہندی کو قانونی بالادستی حاصل رہی ہو، مگر لسانی اور علمی نقطہ نظر سے آج صورت حال یہی ہے کہ اردو اور ہندی دو رسم الخط میں، دو آزاد زبان ہیں۔ ان کے دو آزاد ادب ہیں۔ دونوں میں مشترکہ عناصر کے باوجود جو دراوڑی زبانوں میں، بنگالی اور میتھلی میں اور چند یورپی زبانوں میں موجود ہیں، یہ دونوں (ہندی اور اردو) دو رسم الخط میں لکھی جانے والی دو آزاد زبانیں ہیں۔

(1) Many Languages & One Nation: Problems of Integration by V.K.R.V. Rao دیکھئے

یہی "ستیم" اور یہی "سندرم" ہے۔ یہی سچ ہے اور یہی حسین ہے۔ کسی بھی زبان کو کسی دوسری زبان پر بالادستی حاصل نہیں ہے۔ سب کا احترام لازم ہے۔ امرت رائے ہوں یا گیان چند جین ہوں، ان کے اس مسئلہ پر فرمودات سے اتفاق کرنا ممکن نہیں کہ یہ فرمودات لسانی اور مذہبی تعصبات (Linguistic & Religious Bias) کا نتیجہ ہیں۔ گیان چند جین کے یہاں تو یہ محبت اور نفرت (Hate & Love) کی معرکہ آرائی ہے۔

زبانوں کے تعلق سے لسانی تشخص (Language Identity) اور لسانی وفاداری (Linguistic Loyalty) کی بھی اہمیت ہے۔ انسان بحیثیت انسان اپنے تشخص اور وفاداری پر قائم رہتا ہے اور اس تشخص اور وفاداری کو تعصب اور بے وفائی کی نذر نہیں کیا جا سکتا۔ جین صاحب کا اردو اور ہندی کے تعلق سے جو رویہ ہے وہ محبت و نفرت اور لسانی بے وفائی کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے لسانی نظریات میں پریشان خیالی (Confusion) کا شکار ہیں۔ اس کا ایک تجربہ مجھے یوں ہے کہ NCERT کے ورک شاپ منعقدہ حیدرآباد (۱۹۸۶ء) میں مدعوین کے اعزاز میں سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ راقم الحروف کے جین صاحب سے عرصہ سے دوستانہ مراسم ہیں۔ اس جلسہ میں میں بھی مدعو تھا۔ تمام مہمانوں کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو میں نے ہندوستان میں لسانی ابلاغ و ترسیل کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے گاندھی جی کے قومی زبان کے نظریہ "ہندوستانی" کی وکالت کی۔ آج بھی ہندوستان کے قومی زبان کے مسئلہ کے سیاسی حل کی حیثیت سے گاندھی جی کے نظریہ ہندوستانی کو پسند کرتا ہوں۔ مگر جین صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا کہ "ہندوستانی" تو کوئی زبان نہیں ہے، یا اردو ہے یا ہندی ہے! اس زمانے میں ساہتیہ اکادمی کے ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کے سوانحی کوائف Whos Who دیکھے تھے۔ اس موقع پر مجھے یہ بات یاد آ گئی کہ جین صاحب نے اپنے سوانحی کوائف میں اپنی مادری زبان "ہندوستانی" لکھی تھی۔ میں نے جین صاحب سے اس وقت فوراً یہ سوال کیا کہ اگر ہندوستانی کوئی زبان نہیں ہے

تو ان کی مادری زبان "ہندوستانی" کا کیا قضیہ ہے۔ جین صاحب سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔ یہ صرف ان کی پریشان خیالی ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی ہندوستانی کے زبردست وکیل تھے۔ پنڈت نہرو، ڈاکٹر تاراچند، مولانا ابوالکلام آزاد اور اکثر قومی رہنما ہندوستانی ہی کے حق میں تھے جس کے لیے اردو اور ناگری رسم الخط تجویز کیے گئے تھے۔ گاندھی جی کی "ہندوستانی" ایک زبان تھی جس کے دو رسم الخط تھے۔ یہ تجویز دو ترقی یافتہ زبانوں اردو اور ہندی دونوں کی محافظت تھی۔ گاندھی جی اردو اور ہندی کو دو ادبی اسالیب مانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو اور ہندی دو زبانیں (بھاشائیں) ہیں جن میں سے تیسری ہندوستانی سرسوتی کی طرح ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ اردو اور ہندی کو ہندوستانی کی پالنے والی بھاشائیں بھی کہتے تھے۔ یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ گاندھیائی ہندوستانی کا سارا رجحان اردو کی طرف ہے۔ وہ اقبالؔ کے ترانہ ہندی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کو ہندوستانی کا نمونہ سمجھتے تھے۔ گاندھی جی کے اس نظریہ کو اگر قبول کرلیا گیا ہوتا تو ہندوستانی، دو رسم الخط میں لکھی جانے والی ایک زبان ہوتی مگر آج اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں ہیں جو دو الگ الگ لکھاوٹوں میں لکھی جاتی ہیں۔

☆......☆......☆

نواں باب

ختم کلام اور ضمیمہ

گیان چند جین صاحب نے اپنی کتاب کو "ختم کلام" پر مہر لگادی ہے۔ ساری کتاب میں اردو کے خلاف زہر افشانی گفتار کے بعد، یہ ختم کلام اردو والوں کے لیے ایک بہلاوہ ہے۔ کتاب میں اردو اور ہندی کا مقابلہ کرنے اور ہندی کی اولیت، ہندی والوں کے اردو کے خلاف منفی رویوں کی وکالت اور برتری ثابت کرنے کی کوشش کے بعد وہ لکھتے ہیں:

"میرا کام اردو ہندی کا موازنہ نہیں ہے صرف اپنی ذاتی پسند بیان
کرتا ہوں۔ مجھے ہندی سے اردو زبان بہتر لگتی ہے۔" (ص ۲۸۲)

اگر اس بیان کو قبول کیا جائے تو پھر یہ کتاب دفتر بے معنی قرار پاتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں موازنہ ہی موازنہ اور اردو اور اردو والوں کی تحقیر ہی غالب تر عنصر ہے۔ اگر ان کی ذاتی پسند ہی مقصود ہے تو قاری پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی پسند ہندی ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ پسند اور ناپسند یا محبت اور نفرت کا کبھی کو حق ہے، لیکن جین صاحب کا یہ کہنا کہ "مجھے ہندی سے اردو زبان بہتر لگتی ہے" یہ شدید احساس گناہ ہے یا منتشر خیالی ہے۔

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ اردو اور فارسی سے جین صاحب کا رشتہ پختہ ہے۔

•

دادا پردادا سے چلی ہوئی لسانی اور تہذیبی روایت جین صاحب اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس تک چلتی رہی، اس سے عام قاری یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ اردو کی جڑیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں دور دور تک پیوست رہی ہیں اور اردو ہماری ایک مشترکہ میراث ہے۔ ان اعتراضات کے بعد اگر کوئی خنجر بکف ہوا تو احساس ہمدردی کے سوائے چارہ کار نہیں رہتا۔ جہاں تک ڈاکٹر پرکاش مونس صاحب کا تعلق ہے، ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بغرض اشاعت جین صاحب نے میرے پاس بھیجا تھا کہ میں اسے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر، بمبئی کے تحت شائع کروں۔ یہ مقالہ جوفل سکیپ (Full Scape) صفحات پر لکھا ہوا تھا، اس کے ہر باب کے آخر میں دس دس پندرہ پندرہ صفحات جین صاحب کی تحریر میں تھے اور اکثر و بیشتر اردو کے خلاف تھے۔ اس سے اندازہ ہو کہ ڈاکٹر پرکاش مونس کے تحقیقی مقالے "اردو ادب پر ہندی ادب کے اثرات" کے پردہ زنگاری میں کون معشوق بول رہا ہے۔ جب ادارہ نے مقالہ شائع نہیں کیا تو جین صاحب بلبلا اٹھے اور مجھے لکھا کہ آپ کے سیکریٹری "اردو دشمن" ہیں۔ سیکریٹری مشہور محقق و مورخ ڈاکٹر پی ایم جوشی تھے، بہت ہی فراخ دل، وسیع القلب اور وسیع الذہن۔ وہ علم دوست بھی تھے اور مسلم دوست اور اردو نواز بھی تھے۔ (اردو دشمنی تو اب گیان چند کا حصہ بن گئی ہے، اردو سے اپنا قد اونچا کرنے اور انعام و اکرام پانے کے بعد) ۱۹۳۸ء میں اقبال کے انتقال کے بعد بمبئی کے آل انڈیا ریڈیو پر انہوں نے (ڈاکٹر جوشی) اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا تھا اور نظم "نیا شیوالہ" پڑھ کر اسے قارئین تک پہنچایا تھا کہ اس نظم میں اقبال نے ایک عظیم پیغام ہندوؤں اور مسلمانوں کو دیا ہے۔ یہ واقعہ ڈاکٹر جوشی نے خود راقم کو بتایا تھا، جس کا حوالہ میں نے اپنے مضمون "اقبال اور بمبئی" میں دیا ہے۔

جین صاحب نے "ایک بھاشا: دو رسم الخط اور دو ادب" پر شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصرے مطبوعہ سبق اردو، کتاب نما، دلی و اردو ادب، دلی (اپریل۔ جون ۲۰۰۶ء) کے

حوالے سے اپنے بہ زعم خود "شاہ کار" ختم کلام کے بارے میں جو سب رس (حیدرآباد) اور ہماری زبان، دہلی (یکم تا ۷ اگست ۲۰۰۶) میں شائع ہوا، لکھا ہے کہ:

"میری حالیہ کتاب ایک بھاشا...... پر شمس الرحمٰن فاروقی نے بڑا مفصل تبصرہ کیا ہے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ "ختم کلام" کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ میری رائے میں اس کی اہمیت متن کتاب سے کم نہیں"۔ جین صاحب کی اپنے "ختم کلام" کے بارے میں یہ رائے شاعرانہ تعلّی سے بھی سوا ہے۔ کتاب اول تا آخر تعصب اور فرقہ واریت سے بھری ہوئی ہے۔ اردو قارئین کو حیرت اس بات پر ہے کہ گیان چند جین صاحب کیوں حیرت زدہ ہیں؟ "ختم کلام" جیسا کہ اس سے قبل لکھا ہے لاف زنی اور بے معنی ہے۔ ابھی اردو قارئین ایسے بھی کند ذہن نہیں ہیں کہ وہ "ختم کلام" کو نہ سمجھیں۔ اخبارات کے مدیر اور رسائل کے ایڈیٹروں نے بھی اسے جین صاحب کے نوٹ کے ساتھ شائع کردیا، ورنہ پھر وہ الزام رکھتے کہ اردو اخبار اور رسائل کے مدیروں نے تعصب برت کر ان کی تحریر شائع نہ کی،، جیسے کہ وہ اس سے قبل اپنی اسی کتاب میں لکھ چکے ہیں۔

گیان چند نے لکھا ہے کہ وہ اردو اور ہندی کا موازنہ نہیں کررہے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ جملے:

> "ہندی کا مزاج وسعت کا ہے اور اردو کا مزاج تنگ نظری کا،
> ہندی اپنا دائرہ زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہتی ہے، اردو اپنا دائرہ
> تنگ سے تنگ کرنا چاہتی ہے۔"

اور اسی طرح کے متعدد جملے موازنہ نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟ "ختم کلام" ایک طرح کا فریب ہے۔ تضاد بیانی کی اس سے اچھی مثال اردو تحقیق وتنقید میں نہیں ملتی۔ یہی حال اردو میں فارسی الفاظ کے ذخیرہ الفاظ کے استعمال اور رسم الخط کے بارے میں بھی ہے۔ یہ اردو والوں کو گمراہ کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ مالک رام کے مذہبی

معتقدات کے بارے میں گیان چند جین نے مکاری کا لفظ ترک کرکے بزدلی یا ڈرپوک کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میں بھی مکاری کے بجائے کوئی نرم سا لفظ استعمال کرنا چاہوں گا، لیکن اس سیاق میں لغت ساتھ نہیں دیتی۔ جین صاحب کے یہاں جرأت اخلاق کی کمی ہے، ورنہ وہ اس طرح کی گول مول باتیں نہ کرتے۔

جہاں تک اردو کی پیدائش اور بیرونی حملہ آوروں کا تعلق ہے، یہ بھی ایک گمراہ کن خیال ہے۔ زبانیں بیک وقت دس بارہ سال یا سو سال میں نہیں بنتیں، یہ لسانی ارتقا کا نتیجہ ہوتی ہیں جو خاموشی سے اپنے اثرات چھوڑتی ہیں۔ یہ کوئی حملہ آوروں کے ساتھ انقلابی تبدیلی کا نتیجہ نہیں ہوتیں۔ یہاں تفصیل میں جانا ضروری نہیں ہے، گزشتہ صفحات میں اس پر گفتگو ہو چکی ہے، جہاں تک غالب کے شعر کی فارسیت کا تعلق ہے انفرادی سطح پر فارسیت کا اثر رہتا ہے اور شاید رہے گا۔ موضوع کے ساتھ زبان بدلتی رہتی ہے۔ انتخاب الفاظ کا تعلق موضوع اور خیال سے بھی ہے اور فنکاری سے بھی۔ عبدالعزیز خالد، اختر الایمان، عزیز قیسی اور جدید تر شاعر عبدالاحد ساز کی زبان فارسی و عربی آمیز ہے۔ ان کا یہ انفرادی اسلوب ہے۔ لفظوں کے استعمال کا تعلق ہمت سے نہیں موضوع اور انفرادی مزاج سے ہے جو اسلوب میں ڈھل جاتا ہے۔ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' اور جے شنکر پرساد کی نظم کامایِنی کی لفظیات موضوع کی دین ہیں۔ ہندی کے قومی شاعر میتھلی شرن گپتا کی مشہور زمانہ خوبصورت اور فکر انگیز نظمیں ''پنچوٹی'' اور ''یشودھا'' کی زبان بھی سنسکرت آمیز ہندی ہے جو اردو اور ہندی میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ اس طرح کی لفظیات ادب کی جان ہوتی ہیں اور زبانوں کی اپنی شناخت بن جاتی ہیں۔ اس کا مطالعہ لسانی اور ادبی جمالیات کے نقطۂ نظر سے کیا جائے تو اس میں افتراق کی بجائے اشتراک اور نفرت کے بجائے محبت پیدا ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے تئیں احترام کا جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے۔ انفرادی، علمی اور ادبی معاملات میں اختلافات کو ہوا دینے کی بجائے باعزت آپسی احترام ضروری ہے۔ اردو اور ہندی کے مسائل پر گفتگو میں باعزت احترام

نگار کو سمجھ نہیں سکے جو اردو ہندی کے بارے میں گفتگو سے پہلے ضروری ہے۔ Respectful tolerence کی ضرورت ہے۔ گیان چند جین اس خوبصورت لسانی زاویہ

گیان چند صاحب نے لکھا ہے کہ "کھڑی بولی عمر میں برج بھاشا سے کم نہیں، اوپر ہی نکلتی ہوگی۔ ان گھڑی پڑی رہتی تھی، اسے باہر سے آئے مسلمانوں نے دیسی کاریگروں کے ساتھ اس طرح گھڑا اور نوک پلک سے سنوارا کہ اب یہ شکل نکلی"۔ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، میری معلومات کی حد تک برج بھاشا کھڑی بولی سے قدیم ہے۔ سنیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے کہ کھڑی بولی سے قبل شمالی ہند میں برج بھاشا کی حکومت یا زور تھا (دیکھئے ہند آریائی اور ہندی از سنیتی کمار چٹرجی) ممکن ہے نئی تحقیقات نے کھڑی بولی کی قدامت ثابت کردی ہو اور جین صاحب کا اندازہ صحیح ہو، لیکن جین صاحب نے یہ بات غیر جانبدارانہ ہو کر کہی ہے کہ مسلمانوں نے دیسی کاریگروں کے ساتھ مل کر کھڑی بولی کو گھڑا اور اس کی نوک پلک درست کی۔ ان کی اس حقیقت پسندانہ غیر متوقع رائے پر خوشی بھی ہوتی ہے اور حیرت بھی۔ انہوں نے کھڑی بولی ادبی اردو کے نمونے، ہندی کے نہیں، جو بنگال میں ہندی تحریک کے زیر اثر سنسکرت الفاظ کی کثرت سے ہندوؤں کی زبان کی حیثیت سے غیر فطری طریقے سے پروان چڑھائی گئی۔

گیان چند جین صاحب کی اردو کے خلاف زہر افشانی کے بعد اس کی خوبصورتی کا یہ ذکر کالی گھٹاؤں کے پیچھے سے لمحہ بھر کے لیے چاند کی روشنی سے کم نہیں۔ زبانیں یقیناً ملکوں اور قوموں کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ اردو، ہندی، مراٹھی، بنگالی، گجراتی، تامل، تلگو، کنڑ اور ملیالم ہی نہیں جو ہندوستان کی عظیم ادبی زبانیں ہیں، چھوٹی چھوٹی قبائلی بولیاں بھی ہمارا قومی سرمایہ ہیں جن کی حفاظت ہماری سرکار کا اور لسانی ماہرین کا فرض ہے۔ ہندی، ہندوستان کی سرکاری زبان ہے۔ ہندوستان میں اردو دوسری سرکاری زبان کے منصب کی مستحق ہے۔ ہندوستان میں اور جنوبی ایشیائی ممالک میں اردو عام بول چال اور رابطہ عامہ کی زبان ہے، جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستانی فلموں اور ڈراموں

(T.V. Serials) کی زبان بھی اردو ہے جسے ہندی کہا جاتا ہے، جو ایک لسانی جھوٹ ہے۔

گیان چند جین کا ''ختم کلام'' عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق ہے۔ ان کی یہ فریب کاری، ضمیمہ (ص ۲۸۸) میں پھر عود کر سامنے آئی ہے۔ اس میں بھی پچھلی کہی ہوئی باتوں کا اعادہ ہے، لہٰذا میں صرف چند نکات کی طرف اشارہ کروں گا۔

اردو ہی نہیں بلکہ ہندی بھی امیر خسرو کو اردو کا پہلا شاعر مانتی ہے، لیکن امیر خسرو (وفات ۱۳۱۵ء) کے بعد عام خیال کے مطابق اردو کا ظہور دکن میں ہوتا ہے۔ تین سو سال کا یہ لسانی خلا، خلاف عقل ہے۔ میں نے ایک مضمون ''مہاراشٹر سے اردو کا لسانی اور ادبی رشتہ'' میں آج سے تقریباً بیس سال قبل آواز اٹھائی تھی کہ اس طرح کا خلا ممکن نہیں ہے، کہیں نہ کہیں یہ لسانی کڑیاں ضرور موجود ہوں گی جن کی تلاش ضروری ہے اور یہی صورت حال حقیقتاً ہے بھی۔

زبانوں کا تشکیلی دور بول چال کا دور ہوتا ہے، تحریری شکل بعد میں وجود میں آتی ہے۔ اردو کھڑی بولی کے ارتقا سے پہلے یہاں دو تحریری روایتیں تھیں، اولاً دیوناگری لکھاوٹ اور دوسرے عربی فارسی رسم الخط، لہٰذا جو لوگ عربی فارسی رسم الخط سے جڑے ہوئے تھے، انہوں نے ادبی اعتبار سے اسے اسی رسم الخط میں محفوظ کیا اور جو لوگ دیوناگری لکھاوٹ سے جڑے ہوئے تھے انہوں نے اسے (بول چال کی زبان کو) دیوناگری میں محفوظ کیا اس طرح اپنے ارتقائی دور میں اردو ایک طرف ادبی سطح پر عربی/فارسی رسم الخط میں محفوظ ہوتی گئی تو دوسری طرف اس کے سنت شاعروں نے اسے دیوناگری کا جامہ پہنایا، لیکن زبان ایک ہی کھڑی بولی اردو/ہندی/ہندوستانی تھی۔ اردو والوں کی نظروں سے دیوناگری میں محفوظ اردو کی ادبی روایت اوجھل رہی، اردو یقیناً ہندوستان کی دیگر لکھاوٹوں میں بھی محفوظ ملے گی۔ تحقیق اور تلاش کی ضرورت ہے۔ میرے کرم فرما و علمی رہنما پنڈت ستیو مادھو راؤ پگڑی نے جو اردو، فارسی، ہندی

اور دڑاوڑی زبانوں کے عالم تھے، مجھے بتایا کہ تھجاور کی فوجی لائبریری میں الہ الدین کا چراغ نامی اردو ڈراما موجود ہے جو تمل رسم الخط میں ہے۔ کوکنی جو مغربی ہندوستان میں ایک بول چال کی زبان ہے، جب اسے ضبط تحریر میں لایا گیا تو اسے اولاً فارسی رعربی رسم الخط میں مسلمانوں نے لکھا، بعدازاں یہ دیوناگری، رومن اور کنڑ رسم الخط میں بھی لکھی گئی، اس طرح کوکنی کو چار رسم الخط میں لکھا گیا۔ اب کوکنی گووا میں رومن رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ زبانیں ابتدا میں صوتی، صرفی اور لفظی تجربے سے گزرتی ہیں اور جب بن سنور کر اعلیٰ اظہار کی منزل میں داخل ہوتی ہیں تو اپنے آپ کو تجربے کی روشنی میں ایک صوتی، صرفی اور لفظی نظام میں پرو دیتی ہیں۔ اردو بھی ارتقا کی اعلیٰ منزلوں میں اس تجربے سے گزر کر اپنی شناخت قائم کرتی ہے۔

اس ساری گفتگو کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اردو کا تسلسل کہیں منقطع نہیں ہوا، لیکن اپنے ارتقا کے ساتھ ساتھ لسانی اور صوتیاتی ضروریات کے تحت آہستہ آہستہ تجربے سے گزرتے ہوئے موجودہ رسم الخط اختیار کیا گیا جسے ہم عربی رفارسی رسم الخط نہ کہتے ہوئے "اردو رسم الخط" کہتے ہیں جس میں سنسکرت کی کوزی آوازیں مثلاً ٹ، ڈ، ڑ بھی شامل ہیں اور ہکاری (Aspirated) آوازیں مثلاً بھ، پھ، ڈھ، جھ، کھ، گھ وغیرہ بھی ہیں اور عربی فارسی کی ح، غ، ف، ق، خ، ط، ظ، ض وغیرہ بھی۔

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی اپنی الگ صوتیات ہے۔ صرفی لحاظ سے ہندی سے مماثلت کے باوجود اس کا صرفی نظام بڑی حد تک مختلف ہے اور اس کی اپنی خصوصیات ہیں جو عربی اور فارسی کے زیر اثر ہیں۔ عربی اور فارسی کے زیر اثر اس میں اظہار کی قوت (Expressiveness) کے ساتھ اضافتوں کی وجہ سے اختصار (Precision) کی خوبی و خصوصیت بھی ہے۔ عربی لاحقے اور سابقے اور علمی اصطلاحات میں بھی وہ ہندی سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اس کی سماجی لسانیات (Languuage Sociology) اور اسلوبیات (Stylistics) بھی مختلف ہیں۔ یہ سارے اجزا یا لسانیاتی پہلو اردو کو ہندی

سے مختلف کر دیتے ہیں اور اس کی شناخت بن جاتے ہیں۔ اس کا اپنا رسم الخط اس کی آزادانہ صوتیات سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کی ہم صوت آوازوں کے لیے جیسے ز، ذ، ض، ظ اور ث اور س، ح اور ہ، ت اور ط اور ژ، ق اور ف اس کی صوتی جمالیات کا حصہ تو ہیں ہی، مگر بول چال میں اگر وہ دب کر ایک طرح کی آواز لگیں تو تحریری نظام میں ان کی انفرادیت باقی رہتی ہے۔ اور ان کی قدر (value) بھی باقی رہتی ہے۔ یہ ترسیمیات Graphemics کا مسئلہ ہے۔

گیان چند صاحب نے اپنی کتاب کے ص ۲۸۹ پر مرزا مظہر جان جاناں کے حوالے سے جو زبان کا کارٹون نما حوالہ دیا ہے وہ دو سو سال قبل کی اس اردو کا نمونہ ہوگا جس کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملیں گی (امرت رائے کے لیے مجبری کا بھی یہاں راز فاش ہوگیا ہے کہ اس اردو کے خلاف غلط انداز کا معشوق کون ہے)۔ لیکن بقول جین صاحب اس کارٹون نما اردو کے برخلاف ایسے کیری کچر یا کارٹون جدید ہندی کی عام خصوصیت ہے، جو قاری اور سامع کے نہ دل کو چھوتی ہے نہ دماغ کو۔ ابلاغ و ترسیل میں جدید ہندی ہمیشہ مار کھاتی ہے تو اردو ہی اس کے لیے سہارا بن جاتی ہے۔

غالبؔ، شادؔ اور اقبالؔ کے اشعار کے حوالے سے جین صاحب کی آرا پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ بول چال کی زبان، ادبی زبان، علمی زبان، سائنسی زبان جیسی مختلف لسانی سطحوں کا ادراک نہیں رکھتے۔ میں نے اس سے قبل میتھلی شرن گپت اور جے شنکر پرساد کی نظموں کا حوالہ دیا ہے۔ موضوع کے ساتھ اسالیب اردو، ہندی، مراٹھی، انگریزی غرض کہ ہر زبان میں بدلتے ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے جو شعر تمسخر کی خاطر پیش کیے گئے ہیں، انھیں شاعروں کے یہاں

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
(غالبؔ)

اور

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
(اقبالؔ)

اور

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں
(شادؔ)

جیسے بالکل مختلف سطح کی زبان کے اشعار بھی ہیں۔ فطری ارتقا میں زبان کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ مصنوعی طور پر کسی خاص مقصد کے تحت جیسے جدید ہندی ہندو قومیت کے لیے بنائی گئی ہے، اس میں اس طرح کی سطحیں نسبتاً کم ہوں گی۔ پریم چند تو خیر اردو ہی کے ادیب تھے، لیکن جب انہوں نے ہندی کو اپنانے کی کوشش کی تو آج کی مشکل ہندی کے مقابلے نسبتاً کم مشکل زبان استعمال کی جو اردو سے قریب تھی۔ جدید ہندی افسانہ نگار کملیشور کی زبان بھی اردو سے ملتی جلتی زبان ہے جو گاندھیائی ہندوستانی کا نمونہ کہی جا سکتی ہے۔

گیان چند صاحب نے (ص ۲۹۰ اور ۲۹۱) پر مسعود حسین رضوی، پھر فیض احمد فیض اور ہاشمی فرید آبادی نیز فرمان فتحپوری صاحبان کے حوالے سے دو باتیں کی ہیں وہ بھی ان بزرگوں کی غلط فہمیوں کا نتیجہ ہو سکتی ہیں، یا اپنی اپنی انفرادی پسند و انفرادیت کا اظہار ہے کہ یہ ہماری زبانوں کی ایک قدیم رسم ہے۔ یہ خاصیت پسندی کے قدیم تصور زبان کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔ ہاشمی فرید آبادی نے کھڑی بولی کے بولے جانے کا اعتراف کیا ہے، یہی عام بول چال کی اردو ہے۔ چونکہ اطراف و اکناف میں حقیقتاً برج یا اودھی یا پوربی بولی جاتی تھیں، ان کا اثر غالب رہا اور کھڑی بولی کا کم۔ یوں بھی

زیر تذکرہ یہ علاقے کھڑی بولی (اردو) برج، اودھی اور پوربی کے فعال دولسانی علاقے ہیں، لہٰذا اس طرح کے مغالطے ہوتے رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان خیالات کو جو اردو کے تعلق سے پیش کیے گئے ہیں انہیں ''نیم سچائی'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ شمالی ہندوستان کے یہ علاقے کبھی ایک لسانی (Monolingual) نہیں رہے۔ گھروں کی بولی اور عام تہذیبی زبان و علمی و ادبی زبان بدلتی رہتی ہے۔ یہ ایک الجھی ہوئی لسانی صورت حال ہے (Complex Linguistic Situation) جو کھلے ہوئے علمی و لسانی نقطۂ نظر سے بہت دلچسپ بھی ہے اور قابل توصیف (appreciable) بھی ہے۔ زبانیں بھرے پورے کثیر لسانی ماحول میں مخاطب (Interlocutors) کے ساتھ بھی بدلتی ہیں۔ ان حالات میں مسعود حسین رضوی ہوں یا فیض و ہاشمی فرید آبادی کے خیالات وہ لسانی برتری یا غلط فہمی کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں اردو مادری زبان کے علاوہ تہذیبی زبان کی حیثیت سے بھی بڑے پیمانے پر استعمال ہوتی ہے اور اکثر اس کی تہذیبی و ادبی حیثیت اس کے مادری زبان ہونے کی حیثیت پر غالب آجاتی ہے۔

اردو کے تعلق سے چند لوگوں کی الگ الگ رائیں ہو سکتی ہیں، اس طرح کی رائیں سبھی زبانوں کے تعلق سے ہوتی ہیں۔ زبان و ادب کے وسیع تر سیاق میں یہ رائیں فیصلہ کن نہیں ہوتیں نہ ہی ان آرا کی روشنی میں حتمی فیصلے اور فتوے دینے کا کسی کو حق ہے (کج فہمی کی الگ بات ہے)۔ جین صاحب نے بھی اپنا تھیسس پیش کرنے کے لیے دور ازکار انفرادی آرا کو پیش کر کے اردو کے خلاف علیحدہ پسندی کا راگ الاپا ہے۔ زبانیں اپنی ارتقائی منزل سے ہوتی ہوئی ترقی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچتی ہیں۔ ابتدائی عوامی شعرا کے یہاں زبانوں کو سمت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے اور خاص الخاص اساتذہ، درباروں اور محفلوں میں اسے منجھ کر توانائی اور معیار حاصل ہوتا ہے۔ صدیوں ترقی کی منزلوں سے گزرنے کے بعد ہی شاعروں، ادیبوں اور عالموں کے ہاتھوں زبانیں معیاری بن جاتی ہیں۔ یہ صرف اردو کی حد تک ہی صحیح نہیں ہے، دنیا کی ساری

زبانوں کا معیار اسی طرح متعین ہوا ہے۔ اگر قدیم عوامی شعرا ہی تک اپنی فکر کو محدود رکھا جائے تو زبانیں محدود قبائلی زبانیں یا گنوار و زبانیں بن کر ہی رہ جاتی ہیں۔ آخر انسان نے بھی قبائلی زندگی سے ترقی کر کے آج کی تہذیبی زندگی اپنائی ہے۔ لنگوٹی چھوڑ کر ہم نے سوٹ بوٹ، شلوار قمیص اور ساڑی کیوں پہنی؟ ...... قرون وسطی کی اہمیت چاہے وہ گورکھ پنتھی ہوں چاہے کبیر پنتھی، انہوں نے اپنے عہد کی بھرپور نمائندگی کی اور اس کے لیے وہ لائق صد احترام ہیں۔ لیکن نئے زمانے کے ساتھ راگ اور ساز اور سر اور تال بدلتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی بقول ڈاکٹر تارا چند "اردو کے آسمان شاعری پر ایک تنہا تارا ہے جو سب سے الگ اپنی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے" ...... اس کی شاعری کے اسالیب اور موضوع مخاطب کے ساتھ بدلتے ہیں۔ اس کے یہاں زبان، موضوع، ہیئت کی رنگا رنگی ہے۔ وہ میلوں، ٹھیلوں، عام گھریلو بول چال، فکر و فلسفے، علم و حکمت کے سارے لسانی اسالیب پر یکساں قدرت رکھتا ہے۔ وہ اردو کا بہت بڑا شاعر ہے، لیکن غالب اور اقبال بننے کے لیے گھریلو زبان ساتھ نہیں دیتی۔ اعلیٰ افکار اور فلسفیانہ خیالات کے لیے اظہار کے پیرائے مختلف ہوتے ہیں۔ زبانیں افکار کی وسیع تر دنیا میں نئے افق تلاش کرتی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی زبان و بیان اور اعلیٰ شاعری سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مگر غالب، مومن، اقبال، فراق، فیض، سردار جعفری، مجروح وغیرہ سے بھی لطف اندوز ہونا چاہیے، لسانی اعتبار سے بھی اور فکری اعتبار سے بھی۔

ضمیمہ میں امرت رائے کی قصیدہ خوانی کے بعد جین صاحب نے سات نکات پیش کیے ہیں۔ جن کا جواب دینا اس لیے غیر ضروری ہے کہ ان کا یہ تعصب ساری کتاب میں آئینے کی طرح روشن ہے مثلاً (ص ۲۹۲) پر ان کا یہ جملہ:

"ان کا موضوع مذہب بھی ہے، لیکن یہ مذہب فتنہ و فساد کرانے والا نہیں"۔ یہ دراصل اسلام اور مسلمانوں کے تئیں تعصب ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی رواداری،

انسان دوستی، جذبہ محبت، اخلاص اور نیکی پر دنیا کی زبانوں میں بے شمار کتابوں میں مواد مہیا ہے۔ کوئی بھی مذہب فتنہ وفساد پھیلانے کی تعلیم نہیں دیتا نہ نفرت پھیلانے کی اور دراڑیں ڈالنے کی۔ صوفیا بھی قینچی نہیں سوئی کا استعمال کرتے رہے ہیں، مگر گیان چند صاحب حسب عادت قینچی چلانے سے کبھی نہیں چوکتے۔

جین صاحب نے ابتدائی کھڑی بولی اردو کے کئی نمونے دیے ہیں، مگر افسوس کہ حضرت گنج شکر، امیر خسرو، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، نام دیو، گیانیشور، ایک ناتھ، اور تکارام اور چند اور نمونوں کے سوا جو کھڑی اردو، ہندی، یا ہندوی کے ہیں، بہت سے دیگر نمونے کھڑی بولی سے نہیں، بلکہ مجہول الاسم بولیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ص ۲۹۸ پر (الف) کے تحت برج بھاشا کی نثر کے نمونے دینے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں برج، ہندی نہیں ایک الگ آزاد زبان ہے جس کا اعلیٰ ادب بھی ہے۔ برج اور اودھی وغیرہ ترقی یافتہ آزاد زبانوں کا ہندی میں شمار کرنا لسانی اور علمی بددیانتی ہے۔

جین صاحب نے ۱۸۰۰ء تک کھڑی بولی ہندی کی دس مستند کتابیں گنائی ہیں۔ مجھے "گنگ کوی" کے نثری رسالے "چھند برمن کی مہما" کے ہندی ہونے میں شک ہے، یہ برج ہو سکتی ہے۔ گنگ کوی کا رسالہ بھی کوئی ایسا معروف رسالہ نہیں تھا کہ اس سے واقف ہونا ضروری تھا، خصوصاً "اردو کے کم نگاہ" معترضین کو۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم ساگر ہی معلوم حد تک ہندی نثر کی پہلی کتاب ہے۔ جین صاحب کیا اردو کی طرح ہندی کے کم نگاہ معترضین سے واقف ہیں؟

جین صاحب امرت رائے کے بعد اپنے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس صاحب کے حوالوں سے زیادہ باتیں کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اس سے قبل لکھا ہے، اس کتاب کا بڑا حصہ جین صاحب کا اضافہ ہے۔ بہرحال وہ اپنے بھائی کو سند مانتے ہیں۔ ایسے محبت کرنے والے بھائی آج کل ملتا ہیں، عام قاری کو اس مثالی محبت سے سبق حاصل

کرنا چاہیے۔ ہاں البتہ محض ناقل ہونے میں ہمیشہ خطرہ اور گمراہی حصہ میں آتی ہے۔ حوالے چاہے بھائی کے ہوں وہ ضروری نہیں کہ مستند اور آسانی ہوں گے اس فہرست کی اکثر کتابیں برج ہیں ہندی نہیں ...... اور چند کتابیں اگر ہندی ہیں تو وہ ہندی سے زیادہ مائل بہ اردو ہیں۔ (ج) کے تحت ۱۸۰۰ سے قبل کی اردو کی نثری کتابیں جو پیش کی گئی ہیں وہ حقیقتاً اردو ہیں۔

یہاں یہ بھی عرض کرنا مناسب ہے کہ ہندی کی قدامت ثابت کرنے کے لیے امرت رائے اور گیان چند کے پیش کردہ نمونے ہندی نہیں، بلکہ کسی مجہول 'لااسم زبان' کے نمونے ہیں جن کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کی قدامت بہرحال مسلم ہے اور ہندی اردو کے خلاف منصوبہ بند طریقے سے فورٹ ولیم اور اس کے بعد پروان چڑھائی گئی۔

☆......☆......☆

دسواں باب

اردو اور ہندی: تاریخی و لسانی تناظر میں

ہندوستان کے لسانی نقشے پر کھڑی بولی کو جو امتیازی درجہ حاصل ہو رہا ہے وہ اس زبان کے بولنے والوں کی کثیر تعداد اور علاقائی پھیلاؤ کی وجہ سے ہے۔ اسے ابتدا میں ریختہ، زبان دہلوی، زبان ہندوستان، ہندوستانی، ہندی اور اردو کے ناموں سے یاد کیا گیا۔ عام بول چال کے علاوہ یہ شعر و ادب کی بھی زبان رہی اور عہد قدیم سے دور جدید تک شمال و جنوب میں رابطے کی زبان کی حیثیت سے بھی مستعمل ہے۔ ہندوستانی کے دور ارتقا میں فورٹ ولیم میں جب انگریزی سیاست غالب آئی تو یہی ہندوستانی، اردو ہندی میں تقسیم ہوئی اور ہندوستانی کے برعکس جو اردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی تھی "ہندوئی" کا آغاز ہوا جو سنسکرت الفاظ کی کثرت کے ساتھ دیوناگری میں لکھی جانے لگی۔ اس نے بعد میں جدید ہندی کا روپ اختیار کیا اور اس اردو، ہندی یا ہندوستانی سے کٹ گئی جو اس کے آغاز سے تین سو سال پہلے سے بول چال اور شعر و ادب کی زبان تھی۔ جسے شیخ فرید الدین گنج شکر، خسرو، نام دیو، ایکناتھ، گرونانک، کبیر، اور میرابائی نے اور پھر قلی قطب شاہ، ولی، وجہی، میر، سودا، میر حسن اور غالب، مومن، میر امن، نہال چند لاہوری، للولال، کاظم علی جوان، انشا اللہ خان انشا اور بھارتیندو ہریش چند نے اپنے تخلص رسا کے نام سے سنوارا تھا۔

گریرسن Grierson نے اپنے شہرہ آفاق جائزہ زبان ہند Linguistic survey of

India Vol 1 Part 1 Chapter 15 میں اردو اور ہندی کے تعلق سے اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ اردو وہ روپ ہے جس میں عربی فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور ہندی وہ ہے جو سنسکرت الفاظ زیادہ استعمال کرتی ہے اور ہندوستانی ان دونوں کو ملانے والی زبان ہے۔ اس نے یہ بات بھی کہی ہے کہ ہندی سے دو زبانیں مراد لی جاتی ہیں۔ ایک سنسکرت آمیز کھڑی بولی اور دوسرے وہ ساری بولیاں جو پنجاب اور بنگال کے بیچ بولی جاتی ہیں۔ اس دوہرے پن Anomaly کے برخلاف گریرسن نے مشرقی و مغربی ہندی ہی کو ہندی مانا ہے۔ یورپی اور ہندوستانی ماہرین میں متعدد علماء نے بھی اسی بات پر زور دیا ہے کہ خالص لسانی نقطۂ نظر سے اودھی، برج، میتھلی، راجستھانی اور بہاری وغیرہ جنہیں اب ہندی کہا جانے لگا ہے، بوجوہ کھڑی بولی ہندی سے الگ اور آزاد، زبانیں ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں جدید ہندی کے عالم بابو ایودھیا پرشاد کھتری نے کہا تھا کہ اودھی اور برج کو ہندی نہیں کہا جاسکتا۔ انہوں نے یہ بھی کہا ''ابھی ہندی میں کویتا ہوئی کہاں، سور تلسی، بہاری وغیرہ نے جس بھاشا میں کویتا کہی ہے وہ تو ''بھاکھا'' ہے ہندی نہیں۔''

زبانوں کے لیے زبان ہونے کی شرط ماہرین لسانیات نے ان کے باہمی طور پر سمجھے جانے یا ان میں آپسی افہام و تفہیم کو قرار دیا ہے۔ لہٰذا باہمی افہام و تفہیم کی کمی بھوجپوری، برج، اودھی، میتھلی اور بہاری کو ہندی بنانے کے مانع ہے اور اسی بنیاد اور اصول کے پیش نظر انہیں ہندی نہیں کہا جاسکتا ہے اور اگر کبھی کبھی اور کہیں کہیں یہ زبانیں تھوڑی بہت آپس میں سمجھی بھی جاتی ہوں تو اس کی وجہ ان آزاد بولیوں یا زبانوں کا علاقائی قرب اور ربط ہے جس کی وجہ سے ان زبانوں کے بولنے والوں میں انفعالی ذولسانیت Passive bilingualism کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح دلی میں ہندی اردو بولنے والوں کا پنجابی زبان کو سمجھ لینا، پنجابی کے ہندی اردو ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ چنانچہ مذکورہ بولیوں کا کسی حد تک آپس میں سمجھا جانا ان

بولیوں کے ہندی ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

اردو بھی جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے کھڑی بولی کا روپ ہے اور یہ ایسے روپ میں بنی سنوری اور نکھری کہ اس نے پڑی بولیوں سے لسانی ماحول میں لین دین بھی کیا اور اپنی شناخت کے ایک مقررہ معیار پر قائم بھی رہی۔ maintained its identity on an established standard اس نے برج کو برج اودھی کو اودھی، بھوجپوری کو بھوجپوری اور میتھلی کو میتھلی ہی جانا۔ ہندی کھڑی بولی کے برعکس اپنے چنگل نہیں پھیلائے۔ جس کی ابتدا فورٹ ولیم میں ہوئی اور جسے ایک تحریک کی صورت بھارتیندو ہریش چندر نے دی تھی۔ اردو کھڑی بولی کی ادبی روایت خسرو، نانک، کبیر، گیانیشور اور نام دیو سے چلی اور اس کا معیار و تسلسل قائم رہا۔ اس کا اسلوب ہندی کھڑی بولی کے مقابلے میں قدیم تر ہے۔ مشہور ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی جو شروع میں اردو سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ (ہند آریائی اور ہندی مطبوعہ احمد آباد ۱۹۴۲ء) ۱۹۷۳ء میں بمبئی میں منعقدہ "ہندوستان۔ ایک کثیر لسانی ملک اور اس کا لسانی مسئلہ" کے موضوع پر ہونے والے ایک تقریری سلسلے میں اپنے قدیم نظریے پر نظر ثانی کرتے ہوئے ہندی اردو کے تعلق سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اردو کی قدامت اور دلآویزی کے معترف ہوئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے عالم زبان پروفیسر ٹی۔ برو نے بھی اپنے ایک مضمون ہندوستان کی جدید زبانیں Modern Languages of India میں لکھا ہے کہ قدامت اور عمر کے اعتبار سے اردو ہندی کے مقابلے میں زیادہ پرانی زبان ہے۔

گریرسن کھڑی بولی کے تعلق سے اردو ہندی اور ہندوستانی تینوں زبانوں کا ذکر کرتا ہے۔ ہندوستانی سے اس کی مراد آسان بول چال کی زبان سے ہے۔ سنیتی کمار چٹرجی نے کھڑی بولی کو پانچ اسالیب میں تقسیم کیا ہے (۱) اردو (۲) اونچی ہندی یا ناگری ہندی (۳) ہندوستانی (۴) ورنا کیولر ہندوستانی (۵) بازاری ہندی یا بازاری ہندوستانی Low Hindi۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ پنجاب اور یو۔ پی کے ہندوؤں کی گھریلو زبان اردو

ہندی کے درمیان کی زبان ہوتی ہے نہ کہ ٹھیٹھ ہندی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ اس سے مراد وہی عام بول چال کی ہندوستانی ہے جس کا سارا جھکاؤ اردو کی طرف ہے۔ عام طور سے جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا واقعتاً اردو ہی ہے۔ اس حقیقت کو وہی لوگ محسوس کریں گے جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں سے واقف ہیں اور زبان کو سیاست کی نظر سے دیکھنے کے بجائے لسانی اور علمی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ گاندھی جی نے شمالی ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ بول چال کی زبان ہی کے پیش نظر ہندوستانی کو قومی زبان بنانے کی وکالت کی تھی، اور آخری دم تک وکالت کرتے رہے اور جس کو کانگریس نے مانا بھی تھا۔ اردو اور ہندی دونوں جو ادبی زبانوں کی حیثیت بھی رکھتی تھیں اور گاندھیائی ہندوستان کو پالنے والی بھاشائیں تھیں اب بدلے ہوئے سیاسی اور لسانی حالات میں اسی ہندوستانی کو چاہے آپ سہل اور آسان ہندی کہہ لیجئے۔ چاہے سہل اردو۔ ہندی اور اردو کے تعلق سے دراصل ہندوستانی ہی ان دونوں کا دامن ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہے۔ ورنہ دونوں کا رجحان بالکل جداگانہ ہے ادبی اعتبار سے بھی اور اسلوبیاتی Stylistic نیز سماجی لسانیات Socio-linguistic کے اعتبار سے بھی۔ یہ ہندوستان کے مخدوش سیاسی اور لسانی حالات میں ایک طرح کا لسانی سمجھوتہ ہے۔

کھڑی بولی اردو کی قدامت کے تعلق سے گریرسن نے لکھا ہے کہ "ادبی زبان کے اعتبار سے ہندوستانی کے قدیم نمونے اردو میں پائے جاتے ہیں اور کھڑی بولی ہندی میں نظم نہیں ملتی۔"

ہندی ادب کے مشہور مورخ شری رام چندر شکل نے بھی اس بات کا اقرار کیا ہے کہ "آرمبھ کال (ابتدائی دور) کے چاروں لیکھکوں (سداسکھ لال، للو لال، سدل مسرا اور انشا) میں انشا کی بھاشا سب سے چٹپٹی، محاورے دار اور چلتی ہوئی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ کھڑی بولی اردو کویتا میں پہلے سے بہت کچھ منجھ چکی تھی۔

ہندی کے مشہور بھاشا شاستری ڈاکٹر دھیریندر ورما بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "تاریخی اعتبار سے ادبی کھڑی بولی ہندی کے مقابلے میں کھڑی بولی اردو کا استعمال زیادہ قدیم ہے اور قدیم عہد وسطیٰ (ابتداء سے ۱۸۰۰ء تک) میں کھڑی بولی ابتدا ہی سے مستعمل تھی۔ لیکن اس بولی کا ہندی کوی اور لیکھک ساہتیہ میں کوئی خاص پریوگ نہیں کرتے تھے۔ اسے مسلمانی بولی سمجھا جاتا تھا۔ کھڑی بولی ہندی کا استعمال نثری ادب میں انیسویں صدی کے آخری حصے میں ہوا اور نظم میں بیسویں صدی میں۔"

مذکورہ حقائق سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ کھڑی بولی کا اصل رنگ روپ اردو میں نکھرا اور انیسویں صدی تک وافر مقدار میں ادبی مواد اردو میں تیار ہوا۔ جب کہ ہندی میں اس کی مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کھڑی بولی اردو کی اس ترقی یافتہ اور راسخ حالت کو دیکھ کر فورٹ ولیم کالج میں انیسویں صدی کی ابتدا میں جدید ہندی ادب کی نگہداشت ہوئی اور اسے اردو کی طرز پر پروان چڑھایا گیا۔

اس تاریخی پس منظر کے بعد اردو اور ہندی کے تناظر میں ایک اور اختلافی رائے کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے۔ اردو اور ہندی میں جو بہناپا ہے اور ان دونوں میں جو مشابہت ہے، اس کے پیش نظر انہیں ایک ہی زبان سمجھنے کی ایک روایت ہے۔ اس خیال کو پیش کرنے میں ہندی کے علماء تو شامل ہیں ہی مگر کبھی کبھی اردو کے عالموں نے بھی ان دونوں کے ایک ہی زبان ہونے پر صاد کیا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کے نقطہ نظر سے اردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں ہے۔" یہی خیال ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے ٹائمس آف انڈیا کے نام ایک خط میں جسے دکن کالج پونا کے کئی ماہرین کے دستخط کے ساتھ بھیجا گیا تھا پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں مسئلے کا دوسرا پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لسانیات ایک پھیلا ہوا علم ہے اس کی متعدد شاخیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ توضیحی لسانیات Descriptive linguistics کے مطابق، جس میں زبان کی ساخت

Structure سے بحث ہوتی ہے، اردو اور ہندی میں گہری مناسبت ہے۔ دونوں زبانوں کا صرفی عمل یکساں ہے۔ لیکن لسانیات صرف توضیحی لسانیات نہیں ہے۔ لسانیات کی دوسری شاخ سماجی لسانیات اور اسلوبیات کے اعتبار سے ان دونوں میں واضح فرق بھی ہے۔ اسلوب، طرز ادا، تلمیحات و استعارات لسانی آداب اور سماجی پس منظر میں، لفظوں کی نشست و برخاست میں فرق ہے اور دونوں کے تہذیبی دھارے دو مختلف سمتوں میں بڑھتے ہیں۔ لہٰذا اگر توضیحی لسانیات کی رو سے ہندی اور اردو ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں تو سماجی لسانیات ان دونوں اسالیب کو آزادانہ حیثیت عطا کرتی ہے۔ اردو اور ہندی کے پس منظر میں لسانی اعتبار سے اس سماجی حسن کو اس کی تمام تر صحت مندی کے ساتھ قبول کرنا ضروری ہے نہ کہ اردو اور ہندی کی نزاع کو غیر صحت مندانہ انداز میں صبر و قہر کے طور پر ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنا۔

سماجی لسانی نقطۂ نظر سے اگرچہ یہ دونوں اسالیب آزادانہ حیثیت رکھتے ہیں، تاہم عام بول چال، بنیادی ساخت اور ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے دونوں میں وصل زیادہ اور فصل کم ہے۔ اردو اور ہندی کے لسانی رشتے میں یہ قرب لسانی نوادرات کی ایک عمدہ مثال ہے۔ کثرت میں وحدت کی تلاش، زندگی کے مختلف شعبوں میں جن میں زبان بھی شامل ہے ہمارا مطمحِ نظر ہونا چاہیے۔ ہمارے لسانی پس منظر میں لسانی صحت مندی کی یہ بھی ایک علامت ہوگی۔ سماجی لسانی سطح پر اگر اردو اور ہندی کا جداگانہ حسن اپنے اندر لسانی جاذبیت رکھتا ہے، تو ضیحی لسانی سطح پر ان دونوں میں مماثلت کی تلاش، ان دونوں میں فکر و آہنگ کی یکسانیت پیدا کرنے میں معاون ہو سکتی ہے۔ صوتی، صرفی، نحوی اور لفظی سطح پر اردو اور ہندی میں یکسانیت ان دونوں میں ایک ہی نسل اور اصل کی طرف نشاندہی کرتی ہے اور ان دونوں کے بہناپے کا ثبوت ہے۔ ان دونوں کی اصل ہندوستانی ہے۔ ان دونوں کی بنیادی آوازیں زبان میں کام کرنے کا عمل، افعال، صفات، حروف جار اور ایک بڑا ذخیرہ الفاظ ان دونوں زبانوں کا مشترک سرمایہ ہے۔

اردو اور ہندی کے سیاق میں اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ اردو ہندی کے اس رشتے کا جو اصل و نسل کا رشتہ ہے، پیار و محبت کا رشتہ ہے۔ ان کا توضیحی لسانیات اور سماجی لسانیات دونوں سطح پر مطالعہ کیا جائے۔ اگر دونوں میں توضیحی لسانی سطح پر مشابہت سے خوش ہونا چاہیے تو سماجی لسانی سطح اور اسلوبیات کی روشنی میں دونوں زبانوں میں جو واضح فرق ہے اس کا بھی احترام کیا جائے نہ کہ ایک کی دوسرے پر فوقیت جتائی جائے اور نہ ایک کو دوسرے کی شیلی (اسلوب) کہا جائے۔ دونوں کی آزادانہ حیثیت کو تسلیم کر کے دونوں میں ابلاغ و ترسیل کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرنا اور علمی سطح پر ان دونوں کو عزت و احترام کے رشتے سے منسلک رکھنا ہے اور دونوں میں جب عزت و احترام کا یہ رشتہ پیدا ہوگا اور ایک دوسرے کی طرف سے شکوک و شبہات دور ہوں گے تو وہ رشتہ قومی یک جہتی کے حق میں زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔ آزاد ہندوستان میں ہندی اور اردو کی حیثیتیں متعین ہیں۔ ایک سرکاری زبان ہے اور دوسری کسی کی نہ ہوتے ہوئے سب کی زبان ہے۔ ''دھومر پان نشیدھ'' بہت کم سمجھتے ہیں لیکن ''سگریٹ پینا منع ہے''، عام فہم ہے۔ جولن شیل وستوئیں لے کر یاترا کرنا۔'' کے مقابلے میں ''جلنے والی چیزیں لے کر سفر کرنا۔'' زیادہ مستعمل ہے۔'' ''جھنڈا اتولن'' کے مقابلے میں جھنڈا لہرانا کہنا زیادہ سہل اور آسان ہے۔ ان سارے جملوں اور فقروں میں بدیسی پن کہیں نہیں ہے۔ اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے اور زبان کے استعمال کے لحاظ سے یہ اردو ہے۔

اردو اور ہندی کا ذخیرہ الفاظ ''شبد بھنڈار'' بنیادی طور سے ہندوستانی ہے۔ عربی اور فارسی کے جو اثرات اردو پر ہیں وہ اسی قدر ہیں جس قدر کہ کسی بھی بدیسی زبان میں بدیسی لفظوں Foreign Words کی گنجائش ہو سکتی ہے اور اسی طرح کے مستعار الفاظ لسانی ربط اور لسانی ربط کے ناطے تہذیبی ربط Cultural contact کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اب جب کہ دنیا تیزی سے سکڑتی جا رہی ہے، اس لسانی اور تہذیبی ربط اور اس کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اردو میں دیسی اور بدیسی الفاظ کے بارے

میں اور اسے منگولوں کی زبان ثابت کرنے کے جوش میں ہمارے سیاستدان بہت پیش پیش رہتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ کے مولف سید احمد دہلوی نے اس بارے میں ایک مکمل تجزیہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی فرہنگ میں شامل کل الفاظ جو ظاہر ہے کہ اردو زبان کے الفاظ ہیں، ۵۴۰۰۹ ہیں، جن میں ہندی کے بشمول پنجابی اور پوربی زبانوں کے الفاظ ۲۱۶۴۴ ہیں۔ اس کے علاوہ ۵۵۴ الفاظ سنسکرت زبان کے ہیں۔ دو الفاظ پالی کے ہیں۔ اک لفظ ملیالم زبان کا ہے اور دو الفاظ برہمی زبان کے بھی اس میں شامل ہیں۔ اس طرح کل ملا کر ۲۲۲۰۳ الفاظ اردو میں ایسے ہیں جن کو خالص دیسی الفاظ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۷۵۰۵ الفاظ ایسے ہیں جو غیر زبانوں کے ہندی کے ساتھ اتصال کے نتیجے میں بنے ہیں اور اب وہ خالص اردو الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد غیر زبانوں کے جو الفاظ براہ راست اردو کے ذخیرہ الفاظ میں شامل ہو گئے ہیں، ان میں سے ۷۵۸۴ الفاظ عربی کے ہیں۔ فارسی کے ۶۰۴۱ الفاظ ہیں، ترکی کے ۱۰۵ عبرانی کے گیارہ اور سریانی زبان کے سات الفاظ ہیں۔ مزید یہ کہ یورپی زبانوں میں سے انگریزی کے ۵۰۰ الفاظ اردو میں شامل ہیں اور ۵۳ الفاظ ایسے ہیں جو مختلف یورپی زبانوں یونانی، لاطینی، فرنچ، پرتگالی اور ہسپانوی زبانوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو میں شامل کل دیسی الفاظ کا تناسب سوا تیں فیصدی ہے۔ سامی فارسی اور ترکی الفاظ تقریباً ساڑھے پچیس فیصدی ہیں اور یورپی الفاظ کا تناسب صرف ایک فیصد ہے۔

فرہنگ آصفیہ کی ترتیب ۱۹۰۸ء میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اردو میں فارسی کے الفاظ بڑھنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ البتہ ہندی اور انگریزی الفاظ یقیناً بڑھ گئے ہیں۔ لفظی سطح پر جدید ہندی اور اردو میں جو فرق ہے اس کے اعتبار سے اردو زبان کے بارے میں مذکورہ تفصیلات کا ہندوستانی سرزمین سے اور اسی طرح ہندی سے

جو قریبی رشتہ ہے، اس کی نشان دہی بخوبی ہو جاتی ہے۔

اردو میں تقریباً ۲۵ فیصد غیر ملکی مستعار الفاظ ہیں اور یہ زبانوں کی عام فطرت ہے۔ بقول ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی:

"آج کسی بھی جدید آریائی بھاشا میں سنسکرت الفاظ ۵۰ فیصدی کے لگ بھگ کہے جا سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہمارے دکھی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جیسا کہ ہم بین طور پر دیکھتے ہیں کہ انگریزی میں بھی ۶۰ فیصد بدیسی (لاطینی و فرانسیسی) اور فارسی میں ۶۰ سے ۸۰ فیصد تک بدیسی (عربی) الفاظ موجود ہیں۔"

صوتی سطح پر اردو کی تمام تر بنیادی آوازیں ہندی اور اردو کی مشترک آوازیں ہیں۔ ہاکاری آوازیں اور معکوسی آوازیں تو بطور خاص ہندوستانی صوتیات ہی کی دین ہیں۔ جن میں معکوسی آوازیں ٹ۔ ڈ۔ ڑ وغیرہ دراوڑی اصوات ہیں جو سنسکرت کے ذریعہ اردو میں داخل ہوئیں۔ مصمتی خوشوں کے اعتبار سے بھی ہندی اور اردو دونوں کا رجحان تسہیل کی طرف ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اردو والوں کا تسہیلی رجحان سنسکرت لفظوں کی طرف زیادہ ہے اور ہندی والوں کا عربی و فارسی الفاظ کے تعلق سے۔

صرفی سطح پر بھی دونوں میں بڑا اشتراک ہے اور نحوی سطح پر دونوں میں کہیں فرق نہیں ہے۔ باہمی اشتراک یا قرب کی یہ ساری مثالیں توضیحی لسانی سطح کی ہیں اور عام بول چال کی سطح پر یا سیدھی سادی نثر پر جو کہانی اور ناولوں میں استعمال ہوتی ہے اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ علمی نثر میں جہاں اصطلاحوں سے سابقہ پڑتا ہے، اردو اور ہندی کے دھارے مختلف سمتوں میں بہنے لگتے ہیں۔ ایک اپنی اصطلاحیں سنسکرت سے حاصل کرتی ہے یا ترجمہ کرتی ہے تو دوسری یعنی اردو کا رجحان عربی فارسی کی طرف ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ رجحان انگریزی اصطلاحوں کی طرف بھی ہو گیا ہے۔ ہندی کا رجحان خالصیت پسندی Purism کا رجحان ہے۔ اردو کا رجحان اس کے منافی ہے اردو شروع

ہی سے ایک ریختہ، ملی جلی یا Mixed زبان ہے اور یہی اس کی صحت مندی کا راز ہے۔

اردو ہندی میں توضیحی لسانی سطح پر جو مشابہت پائی جاتی ہے۔ اسی کی بنیاد بناتے ہوئے کچھ ماہرین زبان و ادب اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان سے موسوم کرتے ہیں یا ایک غالب رجحان یہ ہے کہ ہندی کو اصل زبان قرار دے کر جو تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے اردو کو ہندی کا اسلوب (شیلی) کہا جاتا ہے۔ اگر اس رویے کو جائز قرار دیا جائے تو مذکورہ حقائق کی روشنی میں زبان کا قدیم ترین اسلوب اردو اسلوب ہے۔ اور ہندی اسلوب (شیلی) کا انیسویں صدی کے نصف تک پتا نہیں چلتا۔ لہٰذا ہندی کو اردو کا اسلوب کہنا صحیح ہے۔ بقول سنیتی کمار چٹرجی "ہندی اردو کا اسلوب ہے نہ کہ اردو ہندی کا جیسا کہ عام طور پر ہندی والے کہتے آرہے ہیں۔ اصل زبان تو اردو ہے اور ہندی اردو کے جوتوں میں پاؤں رکھ کر چلنے کی کوشش کررہی ہے۔" (ہندوستان کثیر لسانی ملک...... ۱۹۶۴ء) لیکن اردو اور ہندی کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر دونوں زبانوں کے آزادانہ ادب کی نشوونما اور جداگانہ تاریخی روایتوں کے ہوتے ہوئے علمی سطح پر دونوں کے جداگانہ استعمال کے پیش نظر ان دونوں کو ایک ہی زبان کے روپ یا اسالیب کہنے کے بجائے ان دونوں کی آزادانہ حیثیتوں کو تسلیم کرلینا ہی زیادہ عملی اور منطقی نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے۔

اردو اور ہندی میں توضیحی لسانی سطح پر جو مشابہت ہے وہ زبانوں کی تاریخ میں کوئی انہونی یا واحد مثال نہیں ہے۔ خود ہندوستانی زبانوں میں سے راجستھانی اور گجراتی میں سندھی پنجابی اور گجراتی میں، بنگالی اور آسامی میں۔ آسامی اور اڑیا میں بھی اردو اور ہندی کی طرح کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بنگلہ اور آسامی کا رسم الخط بھی یکساں ہے۔ لیکن ابھی تک کسی نے ان زبانوں کی تاریخی روایات سے روگردانی کرتے ہوئے ایک دوسرے کی شیلی نہیں کہا۔ بلکہ ان کی اپنی اپنی آزادانہ حیثیت کو من و عن تسلیم کیا۔ پھر یہ ضد صرف اردو ہی کے تعلق سے کیوں؟

ہندوستانی زبانوں کی طرح یورپ کی بھی متعدد زبانیں اپنی ساخت Structure کے اعتبار سے آپس میں مماثلت رکھتی ہیں اور بول چال کی سطح پر ان میں افہام وتفہیم کا رشتہ بھی ہے۔ مثلاً فرانسیسی، اطالوی Italian پرتگیزی اور ہسپانی زبانیں آپس میں سمجھی جاتی ہیں۔ مگر ان زبانوں کی تاریخی اور ادبی روایتوں کے پیش نظر کوئی ایک کی دوسری پر فوقیت نہیں جتاتا اور نہ ہی ایک کو دوسرے کا اسلوب کہہ کر دوسری کو اپنے چنگل میں لینا چاہتا ہے۔ یہاں پر ہر زبان کی تاریخی اور ادبی روایات سے ان زبانوں کی شناخت کا احترام کیا جاتا ہے۔ جرمنی، آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ اور یورپ کے دیگر چھوٹے علاقوں میں لوگ جرمن زبان کو اپنی زبان سمجھتے ہیں اور یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ساری بول چال کی جرمن آپس میں مماثل نہیں ہے اور جرمن زبان کی مختلف شاخوں میں وہ فرق بھی محسوس کرتے ہیں تاہم اس فصل کی شدت کے باوجود انہیں آپس میں بولی ہی کا درجہ دیتے ہیں۔ جب کہ ان میں کئی متعدد بولیاں دیگر جرمن بولیوں کے لحاظ سے آپس میں بالکل ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ ان میں کئی بولیاں تو سکینڈی نیوین Scandinavian زبانوں مثلاً سویڈش Swedish ڈینش Danish اور نارویجین Norweigian کے مقابلے میں بھی آپس میں مختلف ہیں۔

ہندی جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک محدود اور مخصوص ذہن و دماغ رکھنے والے طبقے کی زبان ہے اور جب کوئی شخص یہ انتہائی مصنوعی زبان بولتا ہے تو سنجیدگی غیر سنجیدگی میں بدل جاتی ہے۔ معیاری ہندی جس کی نشوونما ہورہی ہے، ابھی بول چال کی حیثیت سے اپنے آپ کو مستحکم نہیں کرسکی ہے۔ اردو ہندی علاقے میں جسے عام طور سے یک طرفہ طور پر Hindi Belt کہا جاتا ہے، اس خطے میں بولی جانے والی متعدد بولیاں ہیں جو صرفی نحوی اور اسلوبیاتی حیثیت سے ہندی سے مختلف ہیں۔ ۱۹۵۶ء کے Official Language Commission نے ان مذکورہ حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندی کو سرکاری معاملات میں استعمال کرنے کی سفارش کی تھی اور یہ کہا تھا کہ ۴۲

فیصد لوگ اسے استعمال کرتے ہیں اور یہ متعدد علاقائی بولیوں سے میل کھاتی ہے۔ اس ذہن کی تائید دراوڑی اور بنگالی زبانیں بولنے والے لوگوں نے نہیں کی تھی۔ اسی موقع پر کمیشن نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہندی زبان کی دو اقسام ہیں۔ ایک وہ جس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ مستعمل ہیں اور دوسرے وہ جس میں فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ بیان بھی ہندی کے حق میں یک طرفہ بیان ہے۔ ہندی اگرچہ بہت تیزی سے ادبی زبان بن گئی ہے لیکن عام بول چال کے لحاظ سے جو زبان رائج ہے وہ ہندوستانی یا اردو ہی ہے جس کا اعتراف سیاسی اغراض و مقاصد اور لسانی آمریت کے پیش نظر عام طور سے نہیں کیا جاتا۔ امریکی ماہر لسانیات پروفیسر جیرالڈ کیلی (۱) کے اس مشاہدے کی بنیادوں کی نفی کرنا مشکل ہے کہ:

> 'At the moment it is probably fair to say that no one is a speaker of Standard Hindi'
>
> ترجمہ: (شاید آج کے حالات میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ معیاری ہندی کا بولنے والا کوئی نہیں ہے۔)

سنسکرت آمیز ہندی کو بول چال میں استعمال کرنے کی شعوری کوششوں کے باوجود عام بول چال کی اردو یا ہندوستانی جس میں فارسی الفاظ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے لسانی اعتبار سے غیر محتاط زبان بولنے والوں کا آج بھی ایک اہم سرمایہ ہے۔ کمیشن نے ریلوے سٹیشنوں اور میلوں ٹھیلوں میں استعمال ہونے والی جس زبان کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بھی خالص علمی اور لسانی اعتبار سے مقبول عام بازاری اردو یا ہندوستانی ہی ہے جس کا مجموعی رجحان معیاری اردو کی طرف ہے۔

---

(1) Jerald Kelly: The Status of Hindi as a Lingua Franca (W.Bright Ed. Sociolinguistico (Mouton 1971) R.1

اردو زبان ابتدا ہی سے اردو علاقوں سے باہر بھی پرورش پاتی اور پروان چڑھتی رہی۔ حیدرآباد، بیجاپور، اورنگ آباد، بمبئی، مدراس اور کلکتہ جیسے اہم مراکز میں شروع ہی سے اس زبان کا بول بالا رہا ہے۔ اردو کی شعری روایتیں دور دراز کے علاقوں میں بھی پیوست رہی ہیں اور اس زبان کو مقبول بناتی رہی ہیں۔ یہ دو چار برس کی نہیں صدیوں پرانی بات ہے۔ چنانچہ ان حقائق کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کے حالات میں ہندی کو غیر ہندی علاقوں میں رائج کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس میں اردو کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس لیے کہ تاریخی اعتبار سے اردو صدیوں پہلے سے یہاں رائج رہی ہے اور اردو ہی کے ہموار کیے ہوئے راستے پر سرکاری زبان ہندی کے لیے فروغ پانے کے سارے بنیادی امکانات پیدا کر چکی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ ہندی، بنگال، پنجاب، آندھرا، مہاراشٹرا اور مدراس وغیرہ دور دراز علاقوں میں اردو کی ہموار کی ہوئی زمینوں میں اپنے لیے بنیادیں تلاش کر رہی ہے۔ ہندی زبان پر اردو کا بہت بڑا احسان ہے اور اردو سے ہندی کا یہ مادرانہ رشتہ ہے۔ اس رشتے میں جو تقدس ہے اس کا احترام ضروری ہے۔

اردو اور ہندی میں جو قرب ہے اور دونوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ مذکورہ ہندوستانی اور یورپی زبانوں کے سیاق میں غور طلب ہے۔ مشہور امریکی ماہر زبان مارٹن جوس Martin Joos نے اپنی کتاب The Five Clocks میں اسالیب زبان سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے۔

Ballyhough railway station has two clocks which disagree by some six minutes. When one helpful Englishman pointed the fact out to a porter, his reply was "Faith, sir, if they was to tell the same time, why would we be having two of them?"

ترجمہ: بیلی ہاؤ ریلوے سٹیشن پر دو گھڑیاں لگی ہوئی ہیں جن میں تقریباً چھ منٹ کا فرق رہتا ہے۔ جب ایک مہربان انگریز نے ایک قلی کو اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا تو اس نے جواب دیا۔ ''یقین رکھئے محترم! اگر یہ دونوں گھڑیاں ایک ہی وقت بتائیں تو پھر دو گھڑیاں لگانے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی۔''

مذکورہ بیان اردو اور ہندی کے سیاق میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ان دونوں زبانوں کی اپنی آزادانہ حیثیت کی تصدیق کرتا ہے۔

☆......☆......☆

منتخب کتابیات

(Select Bibliography)

اردو

۱۔ مہاتما گاندھی، مشترکہ زبان (مہاتما جی نے کیا سوچا تھا)، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

۲۔ مسعود حسین خان ڈاکٹر، مقدمہ تاریخ زبان اردو، علی گڑھ

۳۔ نارنگ گوپی چند ڈاکٹر، امیر خسرو کا ہندوی کلام، ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس دلی

۴۔ مونس پرکاش ڈاکٹر، اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر، الہ باد

۵۔ فرمان فتح پوری، ہندی اردو تنازع، اسلام آباد

۶۔ فاروقی شمس الرحمن، اردو کا ابتدائی زمانہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

۷۔ شوکت سبزواری ڈاکٹر، داستان زبان اردو، کراچی، پاکستان

۸۔ خلیل احمد بیگ ڈاکٹر، لسانی تناظر، علی گڑھ

۹۔ عبدالودود ڈاکٹر، اردو سے ہندی تک

۱۰۔ محمود شیرانی پروفیسر، پنجاب میں اردو

۱۱۔ پنڈت دتاتریہ کیفی، کیفیہ، دلی

۱۲۔ ہاشمی فرید آبادی، پنجاہ سالہ تاریخ، علی گڑھ

۱۳۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، نئی دہلی

۱۴۔ شیخ محمد اکرام، رود کوثر، نئی دہلی

۱۵۔ اردوئے معلی (لسانیات نمبر)، دلی یونیورسٹی، دہلی

۱۶۔ گیان چند، ڈاکٹر، حقائق

۱۷۔ گیان چند، ذکر و فکر

۱۸۔ خلیق احمد نظامی، سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے

۱۹۔ ہارون خان شیروانی، دکنی کلچر، شعبہ اردو، دلی یونیورسٹی

۲۰۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، اعظم گڈھ (جلد اول، دوم، سوم)

۲۱۔ مولوی عبدالحق اردو کی ترقی میں صوفیائے کرام کا کام۔ انجمن ترقی اردو، ہند، دلی

۲۲۔ انشاء اللہ خان انشا، دریائے لطافت

۲۳۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت، رسالہ زبان دانی۔ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۹ء

۲۴۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت، جان اردو۔ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۰ء

۲۵۔ ہندی، ہندوی پر ایک نظر، ڈاکٹر ابو محمد سحر، بھوپال

انگریزی

1. S.K. Chatterji: Indo-Aryan & Hindi
2. S.K. Chatterji: India: A polyglot Nation & its Linguistic Problems, Mumbai.
3. Rao V.K.R.V.: Many Languages and one Nation: Problem of Integration, Mumbai.
4. Tarachand: The Problem of Hindustani - Allahbad.
5. Tarachand: Influence of Islam on Indian Culture.
6. Aziz Ahmed: Islamic Culture in Indian Environment OUP.
7. M. Satyanarayana: The Place and Position of a Link Language, Mumbai.

8. C.D. Deshmukh: Hindustani; Rashtra Bhasha or Lingua Franca, Mumbai.
9. B.N. Pande: Islam and Indian Culture - Khuda Baksh Oriental Public Library.
10. Bloomfield: Language
11. Gleason G.A.: An Introduction to Descriptive Linguistics, 1963.
12. Wadia A.R.: The Future of English in India. Asia Publishing House, Bombay - 1954.
13. Jayant Gadkari: Hindu-Muslim Communalism - A Panchnama - Bombay, 1999.
14. Publication Division: Affinity of Indian Languages.
15. Chagla M.C.: On Language and Unity, Popular Prakashan - Bombay.
16. U. Weinreich: Languages in Contact, Mutoun - Hagne - 1963.
17. Robert Hall: Pidgin and Creole, Cornell University - 1966.
18. Ralph Russel: In Pusuit of Urdu Literature.
19. William Bright: Sociohigusstics - Mouton.
20. W.H. Whitley:
21. Swaihili
22. Le Page: The National Language Question of Newly Developing Countries. Oxford University Press, London. 1964.
23. Jules Block: Indo - Aryan

24. Romila Thappar Harbans Mukhia & Bipin Chandra - Communalism and the Writing of Indian History.

25. Robert Lado: Linguistics Across Culture - Ann Arbour - the University of Michingan Press - 1957.

26. Ambikaprasad Vajpai: Influence of Persian on Hindi - Calcatta University - 1935.

27. Pandit Jawaharial Nehru: The Discovery of India.

28. Madan Gopal: This Hindi and Devangari, Delhi 1953.

29. Ram Gopal: Linguistic Affairs of India - Asia Publishing House.

30. Christopher King: One Language two Scrips - Oxford University Press - 1991.

31. Brass Paul: Language, Religion and Politics in North India Vikas Publishing House Delhi - 1975.

32. Amrit Rai: A House Devided- Oxford.

33. Alok Rai: Hindi Nationalism

34. Martin Joos: The Five Clocks Mouton & Co.

35. Madan Gopal: Origin and Development of Hindi / Urdu Literature, Deep & Publications New Delhi - 1996.

☆......☆......☆




ادبی اور لسانی تحقیق













